قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ.....

انوار تحقیق

جلد۔۲ شمارہ۔۶ تا ۱۲ جون تا دسمبر ۲۰۱۶ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰روپئے سالانہ:۔۵۰۰روپئے

نگراں:۔ **پروفیسر عزیز بانو**، صدر شعبہ فارسی، مانو، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔ **سید الیاس احمد مدنی**

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔500 008

موبایل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد
ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی
ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان۔صدر شعبہ فارسی، بمبئی یونیورسٹی، ممبئی
ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ
احمد نوید یاسر ازلان حیدر
مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری، لکھنؤ
ارمان احمد
مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار
عاطفہ جمال
مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی
شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن
متی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن
عباس حیدر نقوی، رسرچ اسکالر، اے ایم یو، علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ
پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی
پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید۔صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر
ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن
ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
احمد علی، کیپر مینسکرپٹ۔سلار جنگ میوزیم، حیدرآباد
ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد
ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن
جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی
امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ		مدیر	۳
۲۔	احوال وآثار میر حسین دوست سنبھلی	(فارسی)	محمد قمر عالم	۴
۳۔	نخلستان در تتبع گلستان	(فارسی)	احمد نوید یاسر ازلان حیدر	۱۰
۴۔	زندگی نامہ وآثار مولوی	(فارسی)	مرتضیٰ لطیفی	۱۴
۵۔	ڈاکٹر عندلیب شادانی: ایک مایہ ناز شخصیت	(اردو)	شمیمہ نسرین	۱۷
۶۔	قصہ انگلی مالا کا: ایک مطالعہ	(اردو)	نبیل مشتاق	۲۳
۷۔	جرجی زیدان: ایک مظلوم مصنف	(اردو)	عبدالرحمٰن	۳۱
۸۔	شاگردان نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ	(اردو)	ڈاکٹر تنویر حسن	۳۳
۹۔	''ناول جس دن سے'' کا فنی وخصوصی مطالعہ	(اردو)	توصیف بریلوی	۴۰
۱۰۔	علامہ عبدالواحد بلگرامی اور ''سبع سنابل''	(اردو)	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین	۴۵

English Part:

1 Intangible Cultural Heritage of Muslims in BareillyDivision: Need to document and safeguard it. Ajmal Husain, Pg. 2

Hindi Part:

1 कितने पाकिस्तान : एक राजनीतिक अध्ययन दरख़्शाँ ग़नी Pg. 12

اداریہ

حیدرآباد دکن ہندوستان کی جنوبی ریاستوں آندھراپردیش اور تلنگانہ کا مشترکہ دارالخلافہ ہے ۔ نظام کے دورحکومت میں دارالسلطنت رہا ہے۔حیدرآباد دکن اپنے سنہری تاریخ اور ثقافت کی وجہ سے مشہور ہے۔حیدرآباد دکن کوموتیوں اورمسلمان نظام بادشاہوں کا شہرکہا جاتا ہے ۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔اردواور تیلگو یہاں کی بولی جانے والی بڑی زبانیں ہیں ۔موجودہ دور میں انفارمیشن ٹیکنالوجی، آئی ٹی اور بایوٹیکنالوجی کا مرکز مانا جاتا ہے۔حیدرآباد کے انفوٹیک پارک کو'' سائبرآباد'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ریاستِ حیدرآباد دکن جس کا جغرافیاءنقشہ ہر دور میں بدلتا رہا17 ستمبر 1948ءتک جب ہندوستانی فوجوں نے نظام کی حکومت کا خاتمہ کیااس وقت تک بھی ایک عظیم رقبہ پر پھیلا ہوا86 ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا انگلستان اوراسکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ تھا۔ 1923ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اگرچیکہ اسلامی مملکتیں جو باقی تھیں سعودی عرب، افغانستان وایران وغیرہ پر مشتمل تھیں لیکن خوشحالی وشان وشوکت کے لحاظ سے ریاست حیدرآباد کو جو بین الاقامی مقام تھااس کا ذکرآج بھی انگریز مصنفین کی تصانیف میں موجود ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی سوانح حیات میں تذکرہ کیا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان معاشی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا ایسے وقت میں نواب میر عثمان علی خان کے گراں قدر عطیات نے بڑی حد تک سہارا دیا۔ مکہ معظمہاور مدینہ منورہ کے پانی اور بجلی کے خرچ بھی ریاستِ حیدرآباد نے اپنے ذمے لے رکھے تھےاوراس عظیم مقصد کے لئے "مدینہ بلڈنگ" کے نام سے شان دار عمارتیں جو کہ آج بھی باقی ہیں مکہ اور مدینہ کے لئے وقف تھیں جن کے کرائے مکہ اور مدینہ کو بھیجے جاتے تھےاس کے علاوہ حاجیوں کو رہنے کے لئے رباط کے نام سے نظام نے مکہ اور مدینہ میں حرمین سے قریب عمارتیں بنوادی تھیں۔ ریاستِ حیدرآباد جس کی تاریخ 13ویں صدی کے آخر میں علاءالدین خلجی کی آمد سے شروع ہوکر بہمنی' شاہی اور آصفجاہی دورتک بیسویں صدی کے نصف تک پھیلی ہوئی ہے۔موجودہ حیدرآباد تقریباً دو ہزار مربع میل پر مشتمل ایک شہر ہے جسکے باقی حصے ریاست آندھراپردیش، کرناٹک اور مہاراشٹرا میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ریاست حیدرآباد کی خصوصیت تھی کہ یہ ہمیشہ امن وآشتی کا علمبردار، ہندومسلم یکجہتی کی مثال اور علم وادب نوازی کی ایک ایسی مثال تھا جس کو دنیا تمام کے علم ودانشور، مفکرین ومورخین نے آکر اپنی خدمات سے مزید چار چاند لگائے۔

شہر حیدرآباد میں دیکھنے لائق کئی تعمیرات ہیں، جن میں مشہور چار مینار سب سے اہم ہے ۔ چند اور، مکہ مسجد، سالار جنگ میوزیم، گولکنڈہ، چومحلّہ پیلس، گگن محل، قطب شاہی مقبرے، جامعہ عثمانیہ، ہائی کورٹ، عثمانیہ دوا خانہ، برلا مندر، فلک نما پیلس، نظام دوا خانہ(NIMS)، حسین ساگر، نہروز والوجیکل پارک، راموجی فلم سٹی بھی اپنی شہرت کا لوہا منوارہی ہیں۔

قارئین کرام کے تذبذب کے لئے واضح کیا جاتا ہے کہ ادبی کاموں سے سرمایہ داروں کی دوری اور ادباء کی معاشی پریشانیوں نے ادب کے کاموں میں کمی واقع کی ہے، زیرنظر شمارہ مقالات کی کمی اور معاشی پریشانیوں کی وجہ سے کئی شماروں پر مشتمل ہے امید کرتا ہوں قارئین کرام درگزر فرمائیں گے۔

مدیر

احوال و آثار میر حسین دوست سنبهلی

محمد قمر عالم، استادیار، بخش فارسی،دانشگاه اسلامی علیگر،

سنبهل از زمانه های قدیم گهوارۀ علم و دانش و مایۀ افتخار شعر و ادب بوده است.در این شهر در هر دور و زمان شخصیتهای گوناگون سر برآوردند که بعضی از آنها عالم متبحر و فاضل، مشایخ ممتاز، شاعر و ادیب منفرد بودند. خلاصه این که در هر نوعِ ادب و هنر شخصیت های پدید آمدند که یکی بر تر از دیگری بود و با تخلیقات و نگارشات خود، اضافاتِ بیش بهای را در خزانۀ علم و ادب عرضه داشتند. در بارۀ علمای و ادبای معروف این خطه و اهمیت تاریخی و ادبی سنبهل، در باب گذشته سخنهای مفصل به بیان آورده شده است. از میان شخصیتهای مهم ادبی شهر سنبهل، یکی میر حسین دوست سنبهلی مولف ' تشریح الحروف'می باشد.میر حسین به دلیل دارا بودن توانای ادبی اش مقام و مرتبه ای والا در زبان و ادب فارسی برای خود رقم زده است ودر شمار شعرای و ادبای نامورانِ قرن هیجدهم میلادی جای بسیار مهم را دارا می باشد. اما پس از بر رسی و آماری بیشتر تذکره های قرن هیجدهم و نوزدهم میلادی بر این نتیجه رسیدیم که اطلاعاتی زیادی در بارۀ احوال میر حسین دوست در دسترس نیست.

اسمش میر حسین دوست و تخلص وی حسینی است و اسم پدرش مولوی سید ابوطالب است و اصل وی از سنبهل ضلع مرادآباد (هندوستان) است. زیرا که خود مولف در تصنیفات و تالیفات خودش اسم پدر را سید ابو طالب آورده است ، مثلاً :

> "مولف این اوراق میر حسین دوست سنبهلی غفراللّٰہ ذنوبه و ستر عیوبه که ولد قبلة الافاضل مولوی سید ابو طالب قدس سره است". [۱]

میر حسین هم خود را در تالیفات خودش به همین اسم یاد کرده است . چنانکه در دیباچۀ تذکرۀ حسینی نوشته است:

> "امابعد خاك راه نبی و علی مولف این اوراق میر حسین دوست سنبهلی ". [۲]

میر حسین در نصف اول سدۀ هشتم میلادی در سنبهل چشم بجهان گشود همه تذکره نگاران وی را از سنبهل نسبت داده اند. میر حسین از زمان کودکی به کسب علم و ادب راغب بود و بدان رجحان داشت. وی تعلیمات ابتدایی را علاوه بر پدر از محضر چندین تن از علما و فضلا کسب کرد. هنوز عمر او ۱۹/نوزده سال بیشتر نبود که بشوق کسب علم و دانش وطن را ترك گفت و به سوی پای تخت هند دهلی روانه شد و در همین جا سکنی گزید. در دیباچۀ تذکرۀ حسینی خودش می نویسد:

> "چون عمر نوزدۀ سالگی از وطن سعادت موطن بخدمت سراپا برکت مخدومی شیخ فضل اللّٰہ مدظله بر سبیل تحصیل علم به دارالخلافت نزهت نهاد شاه جهان آباد وارد گشت. و عمری در اکتساب علوم ادبیه بگذرانید و بفیض مجالست فصحای شیرین

کلام و شعرای بلاغت انتظام در فن شعر مهارتی بهم رسانید'.۳

آن زمان که میر حسین در دهلی با دوستانش در محافل علمی و ادبی سرگرم بود احمد شاه ابدالی به دهلی حمله کرد و دهلی از هر سوصحنهٔ جنگ و خونریزی شد. هر گوشهٔ دهلی منظره ای از هنگامه ریزی، بد امنی و قتل و کشتار بود. ازینرو رونق محافل ادبی رو به کاسته شدن گذاشت و مردم از ترس جان خود به دیگر شهرها می گریختند. چنانچه میر حسین نیز مانند دیگر از دهلی خارج شد و به استان روهیل کهند در شهر بریلی آمد و همانجا مقیم شد. در اینجا دیگر خبری از محافل ادبی چون دهلی نبود، علاوه بر این دیگر حلقهٔ دوستان و احباب نیز نبود تا نشسست های شعری برپا شود. چنانچه ایشان تصمیم گرفت تا با قلم خدمات علمی و ادبی خود را انجام بدهد. رفته رفته میر حسین ذوق و شوق ادبی و قلب مملو از احساسات خود را برای عموم به نمایش گذاشت.وی در بیشتر محافل ادبی شرکت می کرد و اشعارش را نیز می خواند.

آثار میر حسین دوست سنبهلی:

زمان میر حسین عهد درخشانی در زمینه های تذکره نگاری، انشاء نگاری، لغت نویسی، علم عروض و بلاغت و قواعد فارسی بوده است. چنانچه او نیز به رسم زمانه تذکره ای به نام 'تذکره حسینی' و در علم بلاغت و عروض و معما و قواعد فارسی کتابی به نام 'تشریح الحروف' را به رشتهٔ تحریر در آورد و در ادب فارسی جایگاهی ممتاز حاصل کرد. علاوه از این یکی از آثار ادبی میر حسین به نام منظوم جنگ نامه هاتفی یا ظفرنامهٔ هاتفی می باشد که میر حسین آنرا به عنوان 'مختصر تیمور نامهٔ هاتفی' جامهٔ نثر پوشانید.در ذیل دربارهٔ آثار مولف اجمالا ذکر کرده می شود:

۱- تذکره حسینی:

تذکرهٔ حسینی تذکرهٔ مهمی است که در قرن هیجدهم تالیف شده و مشتمل است بر تراجم احوال پانصد و شصت و چهار نفر از شعراء و فضلا و اولیاء و ملوك و عرفا از متقدمین و متاخرین که شعر هم سروده اند. حسینی این تذکره را به ترتیب الفبا از روی حرف اول اسم یا تخلص آنها ترتیب داده و تیمنا به ذکر حضرت امیر المومنین علی علیه السلام شروع کرده و با یوسفی طبیب خراسانی بپایان رسانیده است.

در آغاز این تذکره مؤلف مناقب و حکایاتی در توصیف و فضایل حضرت علی نقل کرده است و یك رباعی و چند بیت از دیوان او آورده است. میر حسین این تذکره را به سال ۱۱۶۳ه تالیف کرده است و مادهٔ تاریخ آن را چنین یافته است:

این نسخه چو یافت زیب اتمام
تاریخ شدش خجسته انجام

۱۱۶۳ه

میر حسین دوست تذکرهٔ خودش را به شاه شرف الدین محمود تقدیم کرده است چنانکه خود

درین باره می نویسد:

"لله الحمد که این مجمع احوال و اشعار اولیا عرفان منبع اقوال شعرا و ظرفا که از حالات عجیب و مقالات غریب لبریز است حسن اتمام پذیرفت و به توقع قبول آن جناب افاضت شمول سراج کاشانهٔ شریعت و طریقت شمع شبستانِ حقیقت و معرفت یگانهٔ حضرت جهان پرور معبود حضرت شاه شرف الدین محمود مدظله رسید و منظور نظر کیمیا اثر آن ذات ملایك صفات حجت الکاملین برهان الواصلین گردید یقین که تا روز قیام مطلوب و مرغوب خاص و عام گردد."[۴]

چاپخانهٔ مشهور 'نول کشور' تذکره حسینی را در سال ۱۸۷۵ء به چاپ رساندد. علاوه بر این در تحقیقات مقاله ای دکترای به عنوان 'تصحیح و تدوین تذکرهٔ حسینی' از طرف دانشگاه اسلامی علیگر در سال ۲۰۱٤ء ارائه شد. خانم دکتر کشور جهان زیدی این تذکره را از فارسی به زبان اردو ترجمه کرده موفق به دریافت سند دکترای خود شد. این ترجمه در سال ۲۰۰۸ء چاپ شده است.

۲- مختصر تیمور نامهٔ هاتفی:

دیگر از آثار ادبی میر حسین به نام مختصر 'تیمور نامهٔ هاتفی' می باشد. این اثر میر حسین در نثر است که مولف آنرا در سال ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹م [۱]از نظم به نثر آورده است. جنگ نامه هاتفی یا ظفرنامهٔ هاتفی که منظومه ایست از عبد الله جامی متخلص به هاتفی که درآن واقعات اسکندر را از اسکندر نامهٔ نظامی گنجوی گرفته به طرز و روش خود نظم کرده بود. میر حسین در اواخر عمر خویشآنرا به عنوان 'مختصر تیمور نامهٔ هاتفی' جامهٔ نثر پوشانید. آغاز کتاب اینطور شده است:

" ستایش شایان و نیایش نمایان مالك الملکی را....الخ"

۳- تشریح الحروف:

تشریح الحروف یکی از آثار مهم و ارزشمند میر حسین دوست سنبهلی در زمینهٔ دستور زبان فارسی و علم بلاغت و تشریحِ الفاظ و معما می باشد و بین کتابهایی که بر این موضوع برشتهٔ تحریر درآمده است، مقام مهمی دارد.دستور زبان فارسی یك موضوع پر ارزش و اهمیت است و در زبان فارسی برین موضوع کتابهای زیادی نوشته شده است. اما تشریح الحروف ازین لحاظ دارای اهمیت خاصی است که مولف درین کتاب نه فقط دستور زبان را بیان کرده است بلکه در ضمن آن صنایع و بدایع لفظی و معنوی و عروض و قافیه و هنر معما را هم ذکر کرده است. درین کتاب شعر مولف هم خوب است. وی نه تنها الفبای فارسی را مفصلاً تشریح کرده است بلکه برای اثبات شواهد را هم آورده است. میر حسین برای واضح ساختن صحبت خود از کلام شاعراتی چون ابو سعید ابی الخیر، سعدی شیرازی، فردوسی طوسی، حافظ شیرازی، عبدالرحمان جامی، مولانا رومی، عرفی شیرازی، امیر خسرو، نظیری نیشاپوری، فیضی، ناصر خسرو، نظامی گنجوی، انوری، خاقانی، صائب تبریزی،ناصر سرهندی، ملا شیدائی فتح پوری، میر غلام نبی بنده، مرزا مظهر جان جانان وغیرآن را به روی کار آورده است. گاهی به گاهی اشعار

خودش را نیز بکار برده است.

'تشریح الحروف' شامل یك مقدمه، ابواب مختلف و یك خاتمه می باشد.

در بارهٔ ارزش و اهمیت تشریح الحروف میر حسین این طور توضیح داده است:

"اطلاعاتی را که من دربارهٔ حروف و کلمات یکجا کرده و رقم کرده ام، کارنامه ای مهم است. زیرا برای تمام جویندگان و دانش آموزان علم و فضل بسیار کار آمد خواهد بود. اطلاعاتی که درین تصنیف یکجا شده است پس از کند و کا و از چندین کتب فارسی انتخاب شده است، تا شایقین علم عروض، بحر، معما و قواعد فارسی تمام نیاز های خود را از همین یك کتاب بر آورده کنند. میر حسین از شایقین و علاقه مندان به زبان و ادب فارسی خواسته بود تا از این کتاب مهم تشریح الحروف نهایت استفاده را ببرند و در حق مصنف دعا فرمایند.۵

تشریح الحروف از لحاظ دستور زبان ارزش و اهمیت خاصی دارد اما تا حالا روی این کار تحقیقی انجام داده نشده است. نسخه های از تشریح الحروف یکی در کتابخانهٔ عمومی صولت، رامپور، یکی در کتابخانه رضا رامپور، دو تا نسخه در کتابخانه مولانا آزاد، علیگر نیز یافته شد که یکی از آنها کامل و خوش خط بود ولی دیگری ناقص است.

شعر و سبك شعر گوئی میر حسین:

میر حسین مرد ظریف و شعر فهم بود. او زبان و ادب فارسی را با دقت مطالعه کرده بود و در فن شعر فارسی و اردو (بهاکا) مهارتی بسیار داشت. بیشتر تذکره نگاران استعداد شعری وی را اعتراف کرده اند.میر حسین در هر دو زبان فارسی و هندی شعر سروده است. وی در فارسی 'حسینی' و در زبان بهاکا 'ذاکر' تخلص می کرد.مولف تذکره عشقی می نویسد:

"ذاکر تخلص، موسوم به میر حسین دوست .از ساکنان مرادآباد بود".

مولف تذکرهٔ گلشن سخن می نویسد:

" مرد ظریف و شعر فهم خوب و در صرف و نحو هم فی الجمله مهارت داشت به ندرت گاهی شعر می گفت در زبان بهاکا. ازوست:

جو چاهو سو کهو مختار هو عدو کو وے
حسین دوست کے دشمن کے تئین یزید کہو

طبق مولف تذکرهٔ روزِ روشن مولوی محمد مظفر حسین صبا:

"حسینی میر حسین از موزون طبعان سنبهل مرادآباد بود"

میر حسین در دورانِ قیام دهلی در بیشتر محافل ادبی شرکت می نمود، کلام شعرای هم عصرش را می شنید و کلام خود را نیز بر آنها عرضه می داشت.چنانکه خودش در تذکره حسینی نوشته است:

"خاك پای سخنوران آفاق میر حسین دوست حسینی مؤلف این اوراق اگر چه اشعار و اقوال این ضعیف نحیف لیاقت آن ندارد که در سلك لطایف پهلوانان عرصهٔ روزگار و شهسواران مضمار معانی انسلاك یابد. لیکن به پاس خاطر احباب این به بیت می نگارد:

بی نور در کلبهٔ تاریك نشستن شبها
این عذابیست که در گور نخواهد بود[۶]

این قطعه بدوستی در شفاعت عزیزی نوشته شد:

بدرگه تو از آنم شفیع می آرد
که هست لطف تو با بنده شهرهٔ کونین
خدا ز جرم جهانی گذشت بهر نبی
تو بگذر از سر یك جرم از برای حسین[۷]

خلاصه اینکه میر حسین طبعی شاعرانه داشت و الحق شعر نیکو می گفت و در تمام اصناف شعری اعم از غزل قصیده، مثنوی، قطعه، ترکیب بند و ترجیع بند وغیرآن طبع آزمائی می کرد . نمونهٔ از غزل اوست:

دهان کوچك و دندان بار را نگرید
دهان کوچك و دندان یار را نگرید
بدرج لعل دُرّ شاهوار را نگرید
رخش ببرگ گل و لاله می فروشد فخر
شگفته رنگی آن نو بهار را نگرید
کجاست نرگس شهلا بچشم او هم چشم
دلی که دوده کشد چشم یار را نگرید
چو او کجا است گل نار وقت پان خوردن
لطافت لب آن گل عزار را نگرید
جلای عارض آن سیمتن چه طرفه جلا است
صفایی صفت آن ساده کار را نگرید
بچهره اش که ازو گوهرش گرفته ببر
بهار قدرت پروردگار را نگرید
دو نار در بریك سرو ناز کرده پدید
عجایب کرم کردگار را نگرید
شداست برگ چنار آتشین ز رنگ حنا
نگار آن کف مرجان شعار را نگرید

بسینه شوق ز یك چند می کند صد چند
تحرك لب آن می گسار را نگرید
حسینی این غزل تازه هر کجا خواند
هجوم مردم تحسین نثار را نگرید۸

میر حسین در فن تاریخ گوئی هم مهارت داشت و در وفات دوستان و هم عصران چند تا قطعۂ نظم کرده بود. بر وفات دوست خودش بنام میر غلام نبی، میر حسین این قطعۂ تاریخ وفات را نظم کرده بود:

همره صفدر ز پی جنگ رفت
تا که بمیدان کند افغان کشی،
از کف شمری که به افغان بخورد
شهد شهادت چو حسین علی،
سال شهادت ولد حسرت زده
گفت کجا آه غلام نبی،۹

غرض این که میر حسین همه عمر خویش خدمات شایانی را برای زبان و ادب فارسی انجام داد و تمام ذوق شوق خود را در میدان علم و هنر به عرضۂ ظهور گذاشت.

حواشی:

(۱) دیباچه، تذکرۂ حسینی، میر حسین دوست سنبهلی، چاپی، انتشارات نول کشور، لکهنؤ، ۱۸۷۵ء.

(۲) دیباچه، ازان. (۳) دیباچه، ازان. (٤) دیباچه، ازان.

(٥) ق. ۱، تشریح الحروف از میر حسین دوست سنبهلی، نسخۂ خطی، ذخیرۂ سبحان الله نسخه، کتابخانه مولانا آزاد، دانشگاه اسلامی علیگر،

(٦) دیباچه، تذکرۂ حسینی، میر حسین دوست سنبهلی، چاپی، انتشارات نول کشور، لکهنؤ، ۱۸۷۵ء. (۷) ص ۳۷، ازان.

(۸) ق-۹۷-ب، تشریح الحروف از میر حسین دوست سنبهلی، نسخۂ خطی، ذخیرۂ سبحان الله نسخه، کتابخانه مولانا آزاد، دانشگاه اسلامی علیگر،

(۹) ص-۵۷، تذکرۂ حسینی، میر حسین دوست سنبهلی، چاپی، انتشارات نول کشور، لکهنؤ، ۱۸۷۵ء.

☆☆☆

نخلستان در تتبع گلستان

احمد نوید یاسر ازلان حیدر، مدیر" دبیر"،دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

در عہد غزنویان، زبان فارسی قبلاً درہندوستان مغربی گسترش یافت و شاعران و نویسندگان نامداری بہ وجود آمدند و بعد از آنہا، لودیان، گام ہای بلندتری درگسترش این زبان درمیان ہندوان برداشتند۔بعد از فرمان معروف راجہ تودرمل، وزیر دارایی اکبر شاہ)قرن 10 و 11 ھ..... ق(مبنی بر این کہ زبان فارسی ، زبان رسمی و اداری شود، ہندوان زبان فارسی را با شوق و رغبت فراگرفتند ۔و از دورہ جہانگیر تا زوال مغولان)قرن 11 – 13 ھ..... ق اوج شکوفایی این زبان درشبہ قارہ است ۔زبان و ادبیات فارسی، بہ دلیل غنای فرہنگی، ادبی، ہنری و علمی خود، پس از نفوذ در شبہ قارہ ہند، از زمان محمود غزنوی، بسیار مورد توجہ و ستایش فرہیختگان، عارفان، شاعران، نویسندگان، مورخان و دانشمندان ہندی قرار گرفت بہ طوری کہ آنان نیز در پروراندن این زبان زیبا و عرفانی، نقش بہ سزایی داشتند و بہ جا گذاشتن آثار و شاہکارہای ادبی و علمی، عشق و علاقہ خود را نسبت بہ آن ابراز کردند۔

لچھمی نراین متخلص بہ شفیقؔ اورنگ آبادی شاعر و نویسندہ معروف فارسی شبہ قارہ بود۔ وی در ۱۱۵۸ھ در اورنگ آباد متولد شدہ بود۔ در چمنستان شعراء و گل رعنا شفیقؔ می گوید:۔

" مولف در گل زمین اورنگ آباد دوم صفر سنہ ثمان و خمسین و ماتہ الف (۱۱۵۸ھ) چہرہ ہستی بر افروخت۔" (۱)

جد او بھوانی داس از لاہور علاقہ داشت و بہ سلك ملازمت اورنگ زیب پیوست ۔ پدر لچھمی نراین، رای منسا رام از دربار نظام وابستہ بود۔دربارۂ این تمام واقعات و قوم و قومیت خود شفیقؔ در گل رعنا می گوید:

" شفیقؔ لچھمی نراین ماتھر مولف این صحیفہ از قوم کھتری کپور است جد او بھوانی داس ہمراہ اردوئے عالمگیری از لاہور وارد دکن شدہ در اورنگ آباد توطن ریخت و بر صیغہ نوکری بسر برده ذی اعتبار بر آمدہ درین جا صاحب اولاد گردید۔"(۲)

شفیقؔ در کتابی " حقیقت های ہندوستان" می گوید کہ پدرش دران دربار دیوان بود۔ لچھمی نراین شفیقؔ درس فارسی از شیخ عبد القادر خواند۔ در یازدہ سالگی می توان شعر گفت و میر عبد القادر مہربانؔ کہ استاد نخست وی بود، او را صاحبؔ تخلصؔ داد(۳)

لچھمی نراین در زبان فارسی و اردو شعر می سرود و در فارسی از غلام علی آزادؔ بلگرامی استاد او بود۔ قبلاً 'صاحب' تخلص می کرد بعداً بہ اشارہ استاد آزادؔ بلگرامی 'شفیقؔ' تخلص اختیار کرد۔ شفیقؔ می گوید:

"بسلك تلامزہ قبلہ دین و دنیا حضرت میر غلام علی آزاد بلگرامی مد ظلہ العالی در آمدہ بتقابل میر

عبد القادر مہربانؔ کہ یکی از مہرۂ تابان آن جناب است پوشیدہ 'صاحب' تخلص قرار دادہ و دیوان غزلیات مردف قریب دو ہزار بیت مرتب ساخت چون مرتبہ والا قدری حیثیت پیدا کرد باصلاح شعراء و قواعد ماہر گردید سابق را محض تقویم پارینہ دیدہ یك قلم بر ہمہ ہا خط کشید۔(۴)"

لچھمی نراین شفیقؔ در فارسی شفیقؔ و در اردو صاحبؔ تخلص می کرد۔ دربارۂ این در کتاب خود چمنستان شعراء می گوید:

" الحال کہ سال ہژدہ از عمر گزشتہ باشد چوں مطلع شد کہ میر محمد مسیح صاحبؔ تخلص در فارسی گزشتہ است بجناب فیض مآب حضرت میر صاحب و قبلہ التماس تخلص نمود آن جناب از راہ شفقت تخلص شفیق عنایت فرمودند لیکن از آنجا کہ ریختہ جات فقیر درین جا بہ عوام و خواص اشتہار یافتہ صاحبؔ تخلص در ریختہ بر قرار داشتہ شد و در بعضی بجور کہ شفیقؔ نمی گنجد ناچار تخلص صاحب آوردہ می شود۔ (۵)"

لچھمی نراین بہ سلك ملازمت عالی جاہ پسر نظام علی خان پیوست وی نویسندہ متنوع بود اما برای نوشتن تذکرہ ہای شعراء زیاد معروف است۔ لچھمی نراین در ۱۲۲۳ھ ق/۱۸۰۸ء فوت شدہ بود۔ شاگرد آن غلام مصطفیٰ سخنؔ اورنگ آبادی قطعہ تاریخ وفات او گفت:

استاد من شفیقؔ افسوس — از سپنجی سرائی فانی رفت
روئے دل از کسی نمی بینم — مایۂ لطف و مہربانی رفت
از حلاوت گذشت نظم ونثر — نمك از شعر و شعر خوانی رفت
سال رحلت رقم کرد سخنؔ — وائی مشاطہ معانی رفت (۱۲۲۳ھ)

آثارہای لچھمی نراین شفیقؔ:

(۱) چمنستان شعراء:۔ تذکرہ شعرای ریختہ گویان بہ زبان اردو
(۲) گل رعنا:۔ تذکرہ شعرای فارسی
(۳) شام غریبان:۔ تذکرہ شعرای فارسی آن کہ مہاجرت کردہ از ایران بہ ہند۔
(۴) تحفۃ الاحباب:۔ نایاب(۶)
(۵) تذکرہ گرو نانك:۔ در ذکر احوال گرو نانك (نایاب)
(۶) تنمیق شگرف:۔ مشتمل بر تاریخ دکن
(۷) حقیقت ہای ہندوستان:۔ مشتمل بر تاریخ ہند
(۸) مآثر آصفی:۔ مشتمل بر تاریخ خاندان آصف جاہ
(۹) بساط الغنایم:۔ مشتمل بر تاریخ مرہتہ
(۱۰) حالات حیدرآباد:۔ مشتمل بر احوال حیدرآباد
(۱۱) مآثر حیدری:۔ (نایاب) مشتمل بر احوال سلطان حیدر علی(۷)

کتب متفرقہ:۔

(۱۲) امرت کهنڈ، (۱۳) خلاصة الهند، (۱۴) سوسن ده زبان، (۱۵) مرات الهند، (۱۶) نخلستان، (۱۷) دیوان شفیقؔ

نخلستان شفیق:-

این کتاب از لچهمی نراین شفیقؔ در حکایات و پند و نصایح و در تتبع گلستان سعدی است- یك نسخه خطی این تصنیف در کتب خانه سالار جنگ محفوظ است-تفصیل کیتلاگ:

عنوان:- نخلستان	موضوع :- ادب نثر
شمار کیتلاگ :- ۳۶۲۸	شمار مخطوطه: ۳۲۴
شمار ایکسیشن:- ۳۴۱۹	خط:- نستعلیق
مصنف:- لچهمی نراین شفیقؔ	سال تالیف:- ۱۲۱۸ھ
اوراق:- ۹۶	سطر:- ۱۳
سائز:- 12.8x6.4 cm	مهر:- یك مهر شفیقؔ در آخر

طرز عبارتهای این کتاب ساده و روان است و مولف نثر را با شعر هم مزین کرده است- به روش صاحب گلستان شیخ سعدی ، وی درین کتاب از پند و نصایح و حکایات کار برده است-دیباچه:-

" مدحت مر یکتائی را تعالیٰ شانه که ذاتش مستغنی از صفات است و صفاتش بیحد و لا نهایت در هر صفتی دو تجلی موجود یکی تجلی جمال که ابقا از لوازم اوست و دوم تجلی جلال که افنا ملازم او پس در هر صفتی وجود و بیداد بهر یك حالت خوف و رجا مهیا:-

اول ما در عدم هم آخر ما در عدم
این وسط موهوم چون طهری که باشد در دو دم(۸)

برای اسم تصنیف می گوید:-

فیض روح حضرت سعدی اگر گردد مدد
باشد این کشته همیشه سبز و مقبول انام
چونکه نخلستان ز نقلستان قریب المخرج است
میتوان این نقل ها را خواندن از هر دو نام (۹)

دربارهٔ تاریخ تصنیف کتاب شفیقؔ خود می گوید:

یکهزار و دو صد و بیجده ز هجرت سال بود
گشت نخلستان بفضل حق تعالیٰ انصرام
گر کنی پیوند طوبی را ز نخلستان شفیقؔ
بر دهد تاریخ تحریرش برای خاص و عام (۱۰)

آغاز تصنیف:-

حکایت: آورده اند روزی فی ما بین امامین معصومین صلوات علیهما لشکر آبی رو داد چون پاسی

ازین معامله در گذشت و از جانب سید الشهداء امام الدین و الدنیا حضرت حسین شهید دشت کربلا نسبت برادر بزرگ عذر خواہی یا تصفیه بعمل نیامد:

خود کان را عذر به محمود باشد با کرام
جام را پا بوسی (۔۔۔۔۱۱) بود لازم مدام(۱۲)

اختتام تصنیف:۔

ہر که در پوستن شعر فتد
زانکه لباس صاحب سخن است
ای شفیقؔ از چه عاصیم لیکن
خالق من غفور ذولمنن است(۱۳)

شفیقؔ این تصنیف منقسم نه کرده است۔ تمام تصنیف در پند و نصایح و اخلاقیات مشتمل است در آخر یك مهر شفیق سبت است۔

حواشی:۔

(۱) گل رعنا ۔ لچھمی نراین شفیقؔ۔ فصل دوم۔ ص ۹۳، (۲) همان۔ ص۹۲
(۳) سہم ہندوان در ادبیات فارسی۔ دکتر سید عبد الله۔ ص ۱۰۴،
(۴) چمنستان شعراء۔ لچھمی نراین شفیق۔ ص ۴۹۴، (۵) همان۔ ص۴۹۴
(۶) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان۔ نریندر بہادر سریواستو۔ ۴۱
(۷) همان۔ ص ۴۰ (۸) نسخه سالار جنگ ص ۱ الف
(۹) همان۔ ص ۶ الف (۱۰) همان۔ ص ۶ الف
(۱۱) همان ص ۱۱ الف کرم خورده (۱۲)همان ص ۱۱ الف

☆☆☆

زندگی نامه و آثارمولوی

مرتضیٰ لطیفی، شعبه فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا جلال الدین محمد در بلخ متولد شد(۱)۔ جلال الدین محمد یکی از بزرگترین شاعر وعارف ایران درقرن هفتم است۔ به مناسبت طول اقامتش درقونیه روم به رومی به مولانای روم مشهور شد۔ هما نطور که درکتاب ادبیات فارسی دربارۂ احوال او نوشته شده است:

" جلال الدین محمد معروف به مولوی یا ملای روم از بزرگترین شاعران عارف ایران درقرن هفتم۔ جلال الدین در بلخ متولد شد ولی به مناسبت طول اقامتش درقونیه به رومی یا مولانای روم مشهور شد۔ جلال الدین فرزند محمد بن حسین ملقب به بهأ الدین ولد می باشد که از طرف مادر از خاندان خوارز مشاه است۔ بهاء الدین ولد از مقربان دربار محمد خوارز مشاه بود ولی به علت رنجش خاطری که از شاه یافت، درسال ۶۱۰ از راه بغداد قصد سفر حج کرد و درنیشابور باشیخ عطار ملاقات کرد وشیخ عطار کتاب اسرارنامه را به جلال الدین که کود کی بیش نبود اهداء کرد، بهاء الدین ولد پس از زیارت حج به شام واز آنجا به لا رنده از مراکز حکومت سلجوقیان آسیای صغیر رفت ومدت هفت سال درآن شهر اقامت کرد وپس ازآن به دعوت سلطان علاء الدین کیقباد که از شاهان بزرگ دانش پرور بود به قونیه رفت وتا آخر عمر درآنجا به ارشاد خلق پرداخت ودر سال ۶۲۸ فوت کرد۔ جلال الدین محمد که هنگام فوت پدر بیست وچهار سال داشت بنا به وصیت او وخواهش علاء الدین بجای پدر نشست وبه ارشاد مردم وتربیت مریدان پرداخت ودر مجالس درس سید برهان الدین محقق ترمذی که از تربیت یافتگان بهاء الدین ولد بود، کسب فیض کردوبه رموز معرفت حق آشنا یی یافت واز او اجازۂ ارشاد گرفت وپس از فوت برهان محقق مجالس وعظ برپا کردد به تربیت شاگردان پرداخت "(۲)

یك بار برحسب اتفاق در سنه 642ھ با عارف بزرگ شمس تبریزی ملاقات کرد پس از این ملاقات مولانا چنان شیفتۂ شمس تبریزی شد که ترك منبر ومحراب کرد هما نطور که درکتاب ادبیات فارسی نوشته شده است از آن شرح ذیل داده است۔

" برحسب اتفاق درسال ۶۴۲ باعارف بزرگ شمس الدین محمد تبریزی برخورد کرد۔

پس از این ملاقات مولانا چنان شیفتۂ شمس شد که ترك منبر ومحراب کرد واز همه

گریزان شد وپیوند خود را با گذشته قطع کرد ودر سلك مریدان شمس درآمد۔ شمس تبریز درسال ۶۴۵ از قونیه خارج شد ودیگر به آنجا بازنگشت۔ مولانا براثر هجران شمس تبریزی آشفته خاطرشد ویکباره از مردمان کناره گرفت ومدتی به حسام الدین چلپی وهمچنان به سرودن غزل ومثنوی مشغول بود تا درسال ۶۷۲ فوت کرد"(۳)

در آثار مولانا جلال الدین رومی یك مثنوی بزرگ است وبه نام مثنوی معنوی مولوی شهرت دارد وشش جلد است جز مثنوئ بزرگ مجموعۀ رباعیات ودیوان غزلیات اوست که به نام دیوان شمس مشهور است۔ مولانا در منثورهم آثار دارد۔ وآثار منثور او "فیه ما فیه" "در مجالس سبعه" "مکاتیب" است ولی مثنوی معنوی در عالم خیلی مشهور است۔او درسنه ۶۷۲ھ وفات یافت۔

مثنوی معنوی:

مثنوی معنوی یك شاهکار زبان وادبیات فارسی است این منظومه که به بحر رمل مسدس محذوف سروده شده۔ این مثنوی برشش دفتر مشتمل است ومجموعۀ ابیات آن به بیست وشش هزارمی رسد۔

دربارۀ مثنوی معنوی از کتاب رهنمائے ادبیات فارسی دیدن گزیده ای۔

مثنوی مهمترین ومعروفترین اثر منظوم عرفانی است که از زمان سروده شدن تا کنون همواره مورد مطالعه وتوجه خاص علاقمندان به تصوف وعرفان واندیشه های لطیف عرفانی وحکمی بوده است وبرآن شرحهای متعدد مبسوط نگاشته اند۔نمونۀ اشعار درج ذیل است:

بعد ازین خونریز درمان ناپذیر
کاندر افتاد از بلائے آن وزیر
یك شه دیگر زنسل آن جهود
در هلاك قوم عیسیٰؑ رونمود
آن جهود سگ بین چه رای کرد
پهلوئے آتش بتے برپای کرد
کانکه این بت را سجود آرد، برست
در نیارد، دردل آتش نشست
پرن سزائے آن بت نفس او نداد
از بت نفسش بتے دیگر بزاد
یك زنے باطفل آور دآن جهود
پیش آن بت، وآتش اندر شعله بود
گفت، ای زن، پیش این بت سجده کن
ورنه در آتش بسوزی بے سخن

بود آن زن پاك دین ومومنه
سجدۂ آن بت نکردآن موقنه
طفل از وبستد، درآتش درفگند
زن بتر سیدد دل از ایمان بکند
خواست تا او سجده آرد پیش بت
بانگ زدآن طفل، کانی لم امت
اندر آمادر، که من اینجاخوشم
گرچه در صورت میان آتشم
اندر آمادر، که اقبال آمده است
اندر آمادر، مده دولت زوست
قدرت آن سگ بدیدی، اندر آ
تابه بینی قدرت فضل خدا
من ز رحمت می کشایم پائے تو
کز طرب خود نیتم پروائے تو(۴)

کتاب مثنوی پر از حکایتهای مسلسل منظومی است که عارف بزرگ از نقل آنها نتائج عرفانی واخلاقی ودینی منظور داشته است۔شیخ بزرگ درهر مورد از احادیث وقرآن مجید واخبار برائ تائید واثبات مطلب ذکر می شود۔

حوالجات

۱۔۱۔ فیہ مافیہ مترجم مولانا شمس بریلوی مٹیا محل دہلی ۲۰۱۱ء ص۱۲
۲۔ رہنمائے ادبیات فارسی ص ۳۴۰
۳۔ رہنمائے ادبیات فارسی ص ۳۴۱
۴۔۱۔ مرآۃ المثنوی ص ۲۵ تلمذ حسین

☆☆☆

ڈاکٹر عندلیب شادانی: ایک مایہ ناز شخصیت

شمیمہ نسرین، 'شعبہ السنہ 'راجشاہی یونیورسٹی' بنگلادیش۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی بنگال کے قابل ذکر اردو شاعروں میں سے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں ایک بڑی خدمت انجام دی اور اپنی ادبی کارناموں سے اردو ادب کو سرمایہ دار کیا۔ بنگال کے ادبی حلقوں میں وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ناقد محقق افسانہ نگار اور صحافی بھی تھے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیت سے ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ نظیر صدیقی کے رائے میں:

"شادانی صاحب نقاد بھی ہیں اور محقق بھی۔ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ شعر و ادب کی ان چاروں صنفوں میں ان کی کارگزاریاں نہ صرف اعلیٰ معیار کی حامل ہیں بلکہ اپنے اندر ایک واضح اور دلکش انفرادیت بھی رکھتی ہیں۔ 1"

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نام وجاہت حسین صدیقی اور عندلیب انکا تخلص تھا۔ نام کے ساتھ شادانی اپنے استاد محترم جناب پروفیسر سید اولاد حسین شاداں بلگری کی نسبت سے اختیار کی۔ (2) شادانی شعر و سخن کی راہ سے انکے استاد نہیں بلکہ مدرسہ عالیہ رامپور میں انکے سب سے زیادہ محترم استاد تھے۔ شادانی کے والد کا نام اشتیاق حسین صدیقی تھا۔ وہ صدیقی شیخوں کے ایک متوسط خاندان کے فرد تھے۔ اور پیشے میں بڑے تجار تھے۔ اگر چہ شادانی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ لیکن انکے میٹرک کی سند میں انکی تاریخ پیدائش یکم مارچ 1905 ہے۔ انکا آبائی وطن سنبھل، ضلع مرادآباد (یوپی) ہندوستان تھا۔ 3

شادانی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ رامپور میں ہوئی۔ وہاں کے تحصیل اسکول سے انہوں نے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ مدرسہ عالیہ سے 1920 میں انہوں نے منشی عالم اور دوسرے سال منشی فاضل کا امتحان کامیابی سے حاصل کی۔ اسکے بعد 1921 میں انہوں نے انگریزی میں میٹریکولیشن اور 1923 میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ 1924 میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان بھی پاس کیا۔ پھر سال اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم-اے کی ڈگری حاصل کی۔ شادانی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے تقریباً چار سال لاہور رہے۔ لاہور میں شادانی کے عزیز دوستوں کے بارے میں ڈاکٹر اقبال عظیم بیان کرتے ہیں:

"لاہور کے قیام میں جیسا کہ انہوں نے خود اپنی ایک تصنیف میں ذکر کیا ہے، ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ان کی ملاقاتیں رہیں، ان کے علاوہ جن مشاہیر ادب سے اس وقت ڈاکٹر صاحب کے تعلقات تھے ان میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم، سید عبدالقادر، مولانا تاجور اور پروفیسر عابد علی عابد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جبکہ مولانا فلک پیما مرحوم ڈاکٹر صاحب کے اہم زلف تھے۔ 4

1921 میں خالصہ ہائی اسکول گردوالہ سے انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ وہاں وہ فارسی کے استاد تھے۔ اس طرح وقتاً فوقتاً انہوں نے کئی اسکولوں اور کالجوں میں ملازمت کی۔ 1926 میں ہندو کالج دہلی میں فارسی کے لیکچرار ہوگئے، جہاں دو برس تک اس حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1928 میں ڈاکٹر صاحب کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہوگیا۔ ترقی کی تمام منازل کو طے کرے کے بعد شعبہ فارسی و اردو کے پروفیسر اور صدر رہیں۔ ڈاکٹر شادانی اس یونیورسٹی میں 1950 تک ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس بھی رہ چکے ہیں۔ 1931 میں ڈاکٹر صاحب یہیں سے لندن یونیورسٹی میں تشریف لے گئے جہاں تین برس تک تحقیقی کام کر کے انہوں نے 1933 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، انکے تحقیقی مقالے کا موضوع ہے "ہندوستان کے مسلمان مورخ"۔ جو انگریزی زبان میں لکھی گئی۔ 5

شادانی کو چھوٹی عمر میں ہی شاعری سے ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ جس میں اپنے وطن کے ماحول کو بڑا دخل تھا۔ اس زمانے میں مرادآباد میں اکثر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور شادانی ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ غرض بچپن سے ان کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ مگر انکی باقاعدہ

شاعری کی ابتدا 1925 سے ہوئی۔ شادانی اپنی آغاز شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میری شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور 'تصویر بہا' میری پہلی نظم ہے جو دیال سنگھ کالج 'لاہور کی بزم ادب کے ایک جلسے میں 29 جون 1925 کو پڑھی گئی۔ سامعین کی بے اختیار داد و تحسین نے دل بڑھایا اور میری دوسری نظم نے گمنام نوارد کو لاہور کے ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس کر دیا۔ 25 مئی 1925 کو "حقیقی زندگی" اور اس کے ساتھ ہی حقیقی شاعری کا آغاز ہوا۔6

ڈاکٹر شادانی نے خود اپنی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور جنوری 1924 سے لے کر اگست 1929 تک اور دوسرا دور جولائی 1935 سے لے کر 1952 یعنی "نشاط رفتہ" کی اشاعت تک۔ 1952 میں انکے پہلے دورں کی شعری مجموعہ "نشاط رفتہ" کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ مجموعی حیثیت سے "نشاط رفتہ" اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور دیگر شعرا کے لئے ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اسکی اشاعت کے بعد اس پر کئی معیاری تبصرے بھی ہوئے اور کئی نقادوں نے ان پر دل کھول کر تعریفیں کیں۔ "نشاط رفتہ" میں چھوٹی بڑی 16 نظمیں اور 22 غزلیں شامل ہیں۔ جو شادانی کی کامیابی کا ثبوت دیتا ہے۔ انکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوالبشر لکھتے ہیں:

"ان کی شاعری ان کے دماغ کی ورزش نہ تھی بلکہ اس کا تعلق دل سے تھا۔ کیونکہ وہ رسمی خانہ پری کے لئے شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے دل کے جذبات و احساسات کو ہی الفاظ کا جامہ پہناتے تھے۔"7

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کے رائے میں:

"ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ مختلف عنوانات کے ماتحت اچھی اچھی نظمیں لکھی بھی ہیں، لیکن وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ عشقیہ مضامین کے اظہار کے لئے غزل جیسی موزوں اور کوئی صنف نہیں ہے۔ ان کی شاعری تمام تر عشقیہ شاعری ہے۔ وہ حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ اس لئے فطری طور پر اظہار خیال کے لیے وہ غزل کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔8"

شاعری اور غزل گوئی میں شادانی کی کامیابی کا راز انکی سادگی و سلاست ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سلیس، سادہ اور ملائم الفاظ میں لکھتے ہیں۔ انکے اشعار کی سادگی قاری پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ ان کا کلام ہر حالت میں ہر شخص کے دل میں اثر کرتا ہے۔ انکا کلام سادگی میں ہی جذبات کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔ شادانی کی سادگی پر سید اقبال عظیم لکھتے ہیں:

"وہی عندلیب جو اپنے شعر اور افسانے میں پھول کی پتی سے زیادہ نرم و نازک نظر آتے ہیں، جب کسی شاعر کی ذہنی تخلیقات کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو یک بیک ان کے تیور بدل جاتے ہیں، ان کا نغمہ بار قلم تلوار کا روپ دھار لیتا ہے اور ان کی رومان پسند طبیعت انگارے اگلنے لگتی ہے اور یہی چیز اس مخالفت کا سبب ہے، جو ڈاکٹر صاحب نے سارے زمانے سے مول لے رکھی ہے"۔9

شادانی کے کلام میں تشبیہات بھی پائی جاتی ہے۔ انکے یہاں تشبیہ زیادہ اور استعارہ کم ملتا ہے۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر لکھتے ہیں:

"اپنی شاعری میں انہوں نے بڑے پر لطف پیرائے میں تشبیہوں اور استعاروں کو سمویا ہے۔ لیکن انکے کلام میں استعاروں کا استعمال تشبیہوں کی بہ نسبت کم ہے۔"10

ڈاکٹر شادانی مہتابی شاعر تھے۔ چاندنی سے انکو خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں چاند، چاندنی اور مہتابی راتوں کا ذکر بڑی شدت سے کیا ہے۔ پروفیسر عطا کاکوی نے "نشاط رفتہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے شادانی کو انگریزی میں MOONTHEOFPOET نام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر لکھتی ہیں:

"چاند اور چاندنی کے ذکر کو انہوں نے جس قدر ادا کے ساتھ بیان کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اس ذکر میں تنوع اور دلکشی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے چاند اور چاندنی کو مختلف احساسات و جذبات کا مظہر بنایا ہے۔11"

شادانی کی مہتابی شاعری کا نمونہ:

چاندنی سے، گلوں سے، نغموں سے
جی بھر آتا ہے کیوں خدا جانے۔12
چاندنی اور اداس تنہائی
تم ہو کس حال میں خدا جانے۔13

اردو شاعری میں خاص طور پر اردو غزل میں محبوب کا تصور ایک ظالم، ستم گر اور بے وفا کے سوا کچھ نہیں ہے۔لیکن ڈاکٹر شا؟ دانی نے اپنی شاعری میں ان روایتی انداز کو نہیں برتا ہے۔انکا محبوب ایک انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔انکے یہاں محبوب و عاشق کے درمیان ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔دونوں ایک دوسرے پر فدا ہیں۔اردو شاعری میں یہ نیا اور اچھوتا انداز انہیں کی شاعری میں نظر آتا ہے۔شادانی کے یہاں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں محبوب کی بے نیازی اور بے وفائی کا شکوہ کیا گیا ہے۔وہ ایک ایسے شخص ہے جسے محبوب کی وفائیں یاد آ کے خون کے آنسو رلاتی ہیں۔محبوب سے شکوہ شکایت کرتے ہوئے انکا انداز بیان بھی بہت نرم و ملائم ہوتا ہے۔انکی شاعری رومان و محبت سے بھرپور ہے۔رومان و محبت کی راہوں میں جو کچھ شاعر کے دل پر گذری ہے اسے شعر کا جامہ پہنا دیا۔شادانی کے عشق و رومان موضوعات صاف ستھرے اور بڑی شائستگی کے حامل نظر آتے ہیں۔سید اقبال عظیم لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک صاحب قلم کی حیثیت سے بیک وقت کئی مختلف المزاج اسالیت بیان کے مالک ہیں، ان کا شعر رومان ترنم میں ڈوبا ہوا ایک ساز ہے، جس سے ان کے دل کی دھڑکنیں نغمے بن کر پھوٹتی ہیں، اور ان کا افسانہ مشاہد حیات و نفسیات انسانی کا ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی زندگی کی تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔14"

شادانی کی عشقیہ شاعری کا نمونہ:

عشق سے ہوتا ہے آغاز حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے۔15
بہت مختصر تھے محبت کے لمحے
مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا۔16

شادانی کی شاعری کا دور اول اور دور دوم کے کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں:

دور اول:

میں ان کو بھولا ہی کب تھا، نفس کا یہ بھی دھوکا تھا
سچ مچ جس کو بھول گئی ہیں، کیا وہ یوں ہی یاد آتا ہے۔17
سنا ہو تم نے شاید، میرے ہمسایوں میں چرچا ہے
کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے۔18
نہ سنو! قصہ ناکام محبت نہ سنو
ہے یہ وہ خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں۔19

دور دوم:

جہاں عہد تمنا ختم ہو جائے
عذاب جاودانی زندگی ہے

رلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات
یہی اک راز میری زندگی ہے۔20
تم بھی دعا کرو کہ خدا مجھ کو صبر دے
یا موت دے کہ صبر کا اب حوصلہ نہیں۔21

تنقید نگار

عندلیب شادانی اردو کے بہترین محقق اور نقادوں میں ہیں۔شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق سے بھی شادانی صاحب کو خاصی دلچسپی تھی۔ادبی دنیا میں انکی شہرت کی اصل وجہ انکی تنقید نگاری تھی۔انہوں نے اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ ماہنامہ ساقی (دہلی) سے شروع کیا۔اس سلسلے میں ان کی کتابیں تحقیقات "دور حاضر کی غزل گوئی" اور متفرق تحقیقی اور تنقیدی مضامین جو دہلی کے قسط وار ماہانہ "ساقی" میں چھاپتے تھے، اس کی اشاعت نے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ان مضامین کے شائع ہونے سے اردو ادب کی تنقیدی دنیا میں انکا نام ابھر آیا۔ان مضامین میں انہوں نے دور حاضر کی غزل کی بھرپور عکاسی کی۔ان میں شادانی نے نئے اور پرانے ادب کا تجزیہ کر کے اردو غزل گو شعرا کی خامیوں اور برائیوں کی نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اس دور کے ممتاز غزل گو شعرا کے کلام سے غلطیاں نکال کر اعراضات کی۔اصغر، حسرت، جگر اور فانی اس زمانے کے بے حد مقبول شعراء تھے۔شادانی صاحب نے ان روایت کو دور کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ان شاعروں نے فرضی اور مصنوعی خیالات کا اظہار کیا ہے۔انکے جذبات سچے نہیں ہیں۔اسی زمانے کے ذہن پر یہ بات نقش کر دیا کہ یہ تمام اہل کمال فی الحقیقت اہل کمال نہیں ہیں۔یہ مضامین شائع ہونے سے بعض لوگوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔کسی نے اسے دوسروں کے مخالف جانا۔کسی نے غزل کا دشمن سمجھا۔شادانی کی اعتراضات کے بارے میں شارب ردولوی کہتے ہیں:

''عندلیب شادانی نے غزل کے خلاف مضامین لکھے اور اس عہد کے مقبول غزل گو شعرا کو اپنا ہدف بنایا۔انہوں نے حسرت، فانی، جگر کے کلام پر شدید اعتراضات کئے اور اعتراضات کی لے اتنی بلند ہو گئی کہ توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔22"

لیکن یہ درست نہیں ہے۔تنقید کا بنیادی مقصد تعمیر ادب ہے۔شادانی بھی "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" کے ذریعہ ادبی خوبیوں کو سامنے لانا چاہتے تھے۔انکا مقصد کسی کی تحقیر و تزکیر اور تضحیک کرنا نہ تھا۔انکی شاعری اور سچی کہانیوں کی طرح انکی تنقید نگاری بھی ایک لحاظ سے انکی آپ بیتی ہے۔ بقول نظیر صدیقی:

"شادانی صاحب تو صرف اتنا چاہتے تھے اور چاہتے ہیں کہ اردو غزل غلط اور غیر صحت مندانہ روایت کی گرفت سے نکل آئے اور ہمارے مایہ ناز شعرا فضول گوئی پر اپنا وقت اور اپنی صلاحیت ضائع نہ کریں۔انہوں نے اردو غزل اور بیسویں صدی کی اردو غزل کی جن کمزوریوں کو بے نقاب کیا تھا اس سے سیکھنے والوں نے بہت کچھ سیکھا۔"23

خامیوں کے باوجود ان کے معاصرین نے ان کی تنقید نگاری کی داد ضرور دی۔انہیں سب نے پڑھا اور بہت کم لوگوں نے اتفاق کیا۔اس لئے اردو تنقید نگاری کی روایت میں انکا درجہ بلند ہوا۔شادانی ایک بار پھر سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔مجموعی طور پر ان کی تنقیدی کاوشوں نے اردو تنقید کو نئی منزلوں کا احساس دلانے میں خاصہ حصہ لیا ہے۔اور اسی کو ان کا سب سے اہم کارنامہ سمجھنا چاہئے۔"دور حاضر اور اردو غزل گوئی" کے علاوہ شادانی نے دو اور کتابیں بھی لکھیں پہلی "تحقیقات" دوسری "تحقیق کی روشنی میں"۔ان دونوں کتابوں میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے۔"تحقیق کی روشنی میں" کے بارے میں نظیر صدیقی کے رائے:

"تحقیق کی روشنی میں" محض تحقیقی مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جن میں تحقیق اور تنقید دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔"24

انکا تحقیقی مقالہ "ہندوستان کے مسلم مورخ" اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس میں تحقیق اور تنقید کا سنگم نظر آتا ہے۔ انکی تنقید میں تاریخی واقعات کے گہرے نقوش بھی ملتے ہیں۔ تنقید کرتے وقت وہ اپنے ذاتی نظریات کو ہی اہمیت دی۔ انکی تنقید انکی شاعری اور افسانوں کی طرح ایک ہی محور پر گردش کرتی نظر آتی ہے۔ تنقید اور تحقیق کے سلسلے میں "پیام اقبال" اور "نقش بدیع" شادانی کے اور دو اہم کارنامے ہیں۔ شادانی کی تنقید صاف، سیدھی اور سلجھی ہوئی تھی۔ تنقید نگاری میں انہوں نے الفاظ کی رنگینی عبارت آرائی، مرفع و مقفع جملے اور تصنع و تکلف کے اہتمام سے احتراز کیا بلکہ اپنے خیالات کو روزمرہ کی عام فہم زبان میں ادا کیا۔ بقول ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر:

"تنقید کرتے وقت شادانی جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ الفاظ، محاورات، صرف و نحو کے اصول کے بڑے پابند تھے۔ ان کی نظر سطحی نہ تھی۔ اس لئے ان کی رائے سے متفق نہ ہونے پر بھی ان کے منطقی دلائل سے انحراف کرنے کا جواز مشکل تھا۔ ان کی تنقیدیں، توضیع و تقیع کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ صحت زبان کا وہ حد درجہ خیال رکھتے تھے۔"25

افسانہ نگاری:

ڈاکٹر عندلیب شادانی بیسویں صدی کے ان چند نثر نگاروں میں سے ہیں جو صحیح زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ شادانی نے زندگی کا بڑا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا۔ انکی دوررس نگاہ اور ہمہ گیر مشاہدہ سے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوٹا۔ اچھے اور برے سب ہی کچھ ان میں شامل ہیں۔ لیکن شادانی نے جس کا بھی ذکر کیا ہو، جس پر بھی قلم اٹھایا ہو، اس پر بھرپور نظر ڈالی ہے۔ مختصر افسانے کی ایک شاخ "سچی کہانی" کے لکھے دمیں انہوں نے ایسا نام پیدا کیا کہ یہ صنف ان سے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ سچی کہانیوں کا سلسلہ انہوں نے 1934 سے شروع کیا۔ یہ افسانے پہلے دہلی کے مشہور رسالے "ساقی" میں چھپتے رہے۔ جس میں انکے سارے افسانے "پریم پجاری" کے فرضی نام سے شائع ہوئے۔ یہ افسانے بہت دلچسپ اور سبق آموز تھے۔ 1943 میں سچی کہانیوں کا پہلا مجموعہ سچی کہانیاں، کے نام سے شائع ہوا۔ 1951 میں دوسرے اور تیسرے مجموعے علی الترتیب "نوش و نیش" اور "چھوٹا خدا" کے نام سے شائع ہوئے۔ پہلے میں پندرہ مختصر افسانے ہیں، دوسرے میں تیرہ اور تیسرے میں دو طویل مختصر افسانے ہیں۔ ایک "چھوٹا خدا" اور دوسرا "بے روزگار" ڈراما کی شکل میں۔ سچی کہانیاں کا رتبہ افسانے سے بڑھ کر ہے۔ شادانی نے افسانے کو حقیقت بنا دیا ہے۔ ان میں زندگی کا عکس ہے۔ حیات کا کوئی نہ کوئی پہلو ہے۔ سچی کہانیاں اسی لئے سچی کہانیاں ہیں کہ ان میں آرائش و زیبائش، تصنع و تکلف اور فنی داؤ پیچ نہیں ہیں۔ ان کہانیوں کی بدولت شادانی کا نام ادبی دنیا میں کسی حد تک مشہور ہو چکا تھا۔ بقول ڈاکٹر ابوسعید نورالدین:

"ڈاکٹر عندلیب شادانی کی جدت پسند طبیعت نے اردو میں سچی کہانیاں لکھ کر اپنے لئے ایک الگ شاہراہ قائم کی ہے، جس پر سوائے ان کے اور کوئی آج تک گامزن نہ ہو سکا۔ اس قسم کے افسانے لکھنے کے لئے جو اخلاقی جرآت چاہیے، وہ شاید بہتوں میں نہیں ہے۔ اس لئے پریم پجاری اس میدان میں انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔"26

سید اقبال عظیم کی رائے میں:

افسانہ نگار کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی ہے، اور وہ یوں کہ افسانہ کا پلاٹ اپنے ذہن سے وہ خود تخلیق نہیں کرتے، بلکہ گردوپیش کی زندگی سے اخذ کر لیتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں تو خیر سچی کہانیوں کا عام رواج ہے، لیکن اردو میں جس التزام کے ساتھ، جس انداز سے، اور جتنی بڑی تعداد میں ڈاکٹر صاحب نے سچی کہانیاں لکھی ہیں ان سے پہلے کبھی کسی نے نہیں لکھیں۔"27

صحافت اور مترجمہ:

1952 میں ڈاکٹر صاحب نے "جادو" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کیا۔ جو بنگال کی تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا اقدام تھا۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث بارہ رسالے شائع کرنے کے بعد "جادو" بند کر دیا گیا۔ 1948 میں "مشرقی پاکستان" کے نام سے اور ایک روزنامہ اخبار جاری کیا تھا۔ لیکن وہ بھی بند ہو گیا۔

ڈاکٹر شادانی دیگر زبانوں کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ بھی کئے تھے۔ انشائے ابوالفضل، چہار مقالہ مصنفہ نظامی محروز، رباعیات باباطاہران میں خاص ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی بنگال کے اردو ادب میں ایک ماہر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے کارناموں سے دامن ادب کو وسیع کیا۔ وہ اردو، فارسی اور انگریزی ہر زبان میں ماہر تھے۔ ان کی تصانیف سے ان کے گہرے علم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ وہ ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مختلف ادبی شوصیں پر تبصرے کئے ہیں۔ اس طرح اردو کے ادبی روایات کے صحیح احساس کو بڑھایا ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں سے ادب اور ادبی معاملات سے دلچسپی عام ہوئی ہے۔

ماخذ

1۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، تحقیق کی روشنی میں، مقدمہ لاہور، 1963، ص6

2۔ پروفیسر اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ڈھاکہ، 1954، ص255

3۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)، ڈھاکہ، 1992، ص23

4۔ پروفیسر اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص256

5۔ ایضا، ص256

6- ڈاکٹر عندلیب شادانی، تعارف۔ نشاط رفتہ

7۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے) ص132

8۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، تاریخ ادبیات اردو، لاہور، 1997، ص 1051

9۔ پروفیسر اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص253

10۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے) ص150

11۔ ایضا، ص152۔153

12۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، نشاط رفتہ، لاہور، 1951، ص155

13۔ ایضا، ص159

14۔ پروفیسر اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص253

15۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، نشاط رفتہ، ص262

16۔ ایضا، ص357

17۔ ایضا، ص12

18۔ ایضا، ص5

19۔ ایضا، ص10

20۔ ایضا، ص142

21۔ ایضا، ص179

22۔ محبوب الرحمٰن فاروقی، آجکل اور ادب کے پچاس سال، 2000، دہلی، ص23

23۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، تحقیق کی روشنی میں، مقدمہ

24۔ ایضا۔ ص10

25۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)، ص205

26۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، تاریخ ادبیات اردو، لاہور، 1997، ص375

27۔ پروفیسر اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص260

☆☆☆

''دہشت گرد سے گوتم بدھ کی ملاقات، قصّہ انگلی مالا کا'' ایک مطالعہ

نبیل مشتاق (نبیل احمد اسد)، لیکچرر اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، سٹیلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی، پاکستان

پوری دنیا میں 9/11 کے واقعہ کے بعد امریکا اور اس کی اتحادی عالمی قوتوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ یہ جنگ جس کا آغاز افغانستان سے ہوا رفتہ رفتہ دنیا کے وسیع خطے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ اس جنگ میں افغانستان، عراق، شام، پاکستان، صومالیہ، سوڈان، یمن، سعودی عرب، لیبیا اور دیگر ممالک میں ہزاروں اور لاکھوں افراد کو دہشت گرد قرار دے کر عالمی طاقتوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب مختلف علاقوں میں جنگی جہازوں اور ڈرون طیاروں سے بمباری کی جاتی ہے اور گولہ بارود سے تباہی مچائی جاتی ہے تو کس طرح اعتماد اور پختہ یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشانہ دہشت گرد ہی بنے یا بہت سے بے گناہ اور معصوم افراد بھی لقمہء اجل بن گئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر صاحب نظر انسان کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر عالمی طاقتوں کے اس دعویٰ کو درست مان لیا جائے کہ اس بمباری کا نشانہ دہشت گرد افراد اور گروہ ہی بنتے ہیں تو پھر کم وبیش چودہ سال سے جاری اس جنگ میں کامیابی ان طاقتوں کا مقدر کیوں نہ بن سکی؟ اور ان کے اس دعویٰ کو تقویت کیوں نصیب نہ ہوئی؟ کہ دہشت گردوں کو طاقت کے زور پر ہی کچل کر ہی اقوام عالم کو امن کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔

عالمی قوتوں کے ان خیالات اور فیصلوں سے عدم مطابقت رکھنے والا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو جنگ کو دہشت پسندی اور انتہا پسندی کے خاتمے، دنیا میں امن کے قیام اور عدم تشدد کے نظریہ کے فروغ میں رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ یہ مکتبہء فکر اور اس سے وابستہ افراد اس حق میں ہیں کہ دنیا سے دہشت گردی اور تشدد کا خاتمہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب دہشت گردی کے بنیادی اسباب کا تدارک کیا جائے اور انتہا پسندوں کے خلاف کم سے کم طاقت کا استعمال کرتے ہوئے، مذاکرات اور گفت وشنید کے ذریعے انہیں راہ راست پر لایا جائے تا کہ کم سے کم خون ریزی کے ذریعے دنیا میں امن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ جب کہ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ عالمی طاقتیں مذاکرات کے ذریعے امن کے قیام میں سنجیدہ دکھائی نہیں دیتی اور یہ طاقتیں نہیں چاہتی کہ دنیا میں امن ومحبت قیام عمل میں آئے۔ دانشوروں کا ایک اور گروہ اس بات پر متفق ہے کہ یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں بل کہ دنیا کے زیادہ سے زیادہ قدرتی وسائل پر قابض ہونے کی ایک منظّم کوشش ہے تا کہ دنیا کے سرمائے کو چند عالمی قوتیں اپنی دسترس میں رکھ سکیں اور دنیا کی ایک بڑی آبادی محکوم بن کر زندگی بسر کرتی رہے۔

عالم اسلام میں یہ رائے زور پکڑ رہی ہے کہ یہ جنگ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں اور ان کے مفادات کو نقصان پہنچانے کی ایک باقاعدہ سازش کا حصہ ہے۔ یہ رائے اس وجہ سے بھی تقویت کی حامل ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بڑا مرکز و محور افغانستان، عراق، شام، پاکستان، صومالیہ، سوڈان، یمن، سعودی عرب، لیبیا اور دیگر اسلامی ممالک ہی ہیں۔ مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا دنیا میں دہشت پسند اور دہشت گرد صرف مسلمان ہی ہیں؟ حالاں کہ اسلام اپنے تو اپنے غیروں میں بھی انصاف، مساوات اور بھائی چارے کے فروغ پر زور دیتا ہے اور تاریخ عالم اس بات کی شاہد بھی ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں عالمی طاقتوں کے یہ نظریات حقائق کے برعکس ہیں۔ تمام مسلمان دہشت پسند نہیں اور اگر کچھ مخصوص گروہ اس راستے پر گامزن بھی ہیں تو وہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے اور ماضی گواہ ہے کہ ان گروہوں کو عالمی قوتوں کی پشت پناہی ہی حاصل رہی ہے۔ جب کہ کچھ گروہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر وہ اس راستے پر چلنے پر مجبور ہوئے ہیں تو اس کا سبب ان پر ہونے والے مظالم اور ان کے بے گناہ افراد کا قتل عام کیا جانا ہے۔ وہ اس بات کے لیے بھی تیار دکھائی دیتے ہیں کہ اگر ان پر ہونے والے مظالم بند کیے جائیں اور انہیں انصاف مہیا کیا جائے تو وہ اس راستے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کو تیار ہیں۔

دور حاضر میں ایک اور سوال جو بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں جاری اس دہشت گردی کو کس طرح سے اپنے منطقی انجام تک

پہنچایا جائے اور کیسے دیرپا امن کے قیام کا حصول ممکن ہے؟اس سلسلے میں دنیا میں دو مختلف آراء رکھنے والے افراد موجود ہیں۔جن میں سے ایک مکتبہء فکر سے تعلق رکھنے والے گروہ کا یہ خیال ہے کہ طاقت کا استعمال ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے جب کہ دوسرا گروہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جو دہشت پسند بات چیت کے حق میں ہیں۔ان سے بات چیت کر کے مسائل کو حل کیا جائے اور انہیں معاشرے کا کارآمد فرد اور شہری بنایا جائے کیوں کہ مستقل امن دہشت گردوں کی کایا کلپ یعنی کردار کی تبدیلی سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جاری اس جنگ نے جہاں تمام مکتبہءفکر سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی اور سوچ کو متاثر کیا وہاں ادیب اور ادب بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا اور دنیا کے تمام خطوں میں تخلیق ہونے والے ادب میں دہشت گردی سے متعلق موضوعات کو جگہ دی گئی ہے۔شاعری اور نثر دونوں میں دہشت گردی سے نفرت اور امن سے محبت کے خیالات کو نمایاں کیا گیا۔ادب کے ذریعے، دنیا میں جاری اس خون ریزی اور بربریت سے متعلق عوامی رائے کو ارباب اختیار تک پہنچایا گیا۔ادب میں دہشت گردی کے تدراک اور اس سے نپٹنے سے متعلق دو قسم کے نظریات سامنے آرہے ہیں۔ایک قسم کے ادب میں عالمی طاقتوں کے طاقت کے ذریعے دہشت گردی پر قابو پانے اور دہشت گردوں کو کچلنے سے متعلق نظریات کی ترجمانی ملتی ہے اور یہ ادب زیادہ تر ان ہی طاقتوں کی پشت پناہی میں تخلیق کیا جارہا ہے جب کہ دوسری قسم کے ادب میں دہشت گردی کو مذاکرات اور گفت وشنید کے ذریعے ختم کرنے اور عدم تشدد کے نظریہ کو فروغ دینے کی سوچ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اردو زبان کے نامور ادیب آصف فرخی کی مترجمہ کتاب ''دہشت گرد سے گوتم بدھ کی ملاقات، قصّہ انگلی مالا کا'' اسی سوچ، فلسفے اور فکر کی آئینہ دار ہے کہ دنیا سے دہشت گردی کا مکمل خاتمہ اور مستقل امن کا حصول، عدم تشدد کے نظریہ کے فروغ اور نفرت کا جواب محبت سے دینے سے ہی کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں بدھ مت مذہب کے بانی گوتم بدھ کے نظریہ عدم تشدد کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔

گوتم بدھ ۵۶۳ ق۔م میں کوہ ہمالیہ کے دامن میں کپل وستو کے راجہ شدھو کے گھر پیدا ہوئے۔ان کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔سدھارتھ کا خاندان کھتری جنگ جُو تھا۔بچپن سے ہی تلوار بازی اور جنگی فنون سکھائے گئے۔مذہب وفلسفہ کی خصوصی تعلیم بھی دی گئی۔گوتم بدھ کی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی اور اس کے بطن سے ایک بیٹا بھی ہوا۔وہ ایک دن اپنے محل کے باہر سیر کر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک بوڑھے پر پڑی جو رینگ رینگ کر چل رہا تھا۔بوڑھے کے چہرے پر دکھ کے آثار بہت گہرے تھے۔دوسرے دن اس نے پھر ایک بیمار شخص کو دیکھا جو سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔بیمار آدمی نہایت اذیت اور تکلیف کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ان دونوں تکالیف کا درد لیے جب تیسرے دن گوتم بدھ محل سے باہر نکلا تو اس نے ایک میت کو دیکھا۔میت کو قبرستان لے جاتے ہوئے اس کے ورثا آہ وزاری کر رہے تھے۔گوتم بدھ ان واقعات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے کردار کی کایا کلپ ہوئی۔وہ اپنی عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کر جنگل کی جانب نکل گئے۔ریاضتوں میں شب وروز بسر کرنے لگے جس کی بدولت انہیں گیان اور نروان نصیب ہوا۔گوتم بدھ نے زندگی کے چار سچ بتائے جو ''دہشت گرد سے گوتم بدھ کی ملاقات، قصّہ انگلی مالا کا'' میں بھی بیان ہوئے ہیں۔یہ چار سچ یہ ہیں:

(۱)۔دکھ، اس زندگی کی اصل حقیقت ہیں۔(۲)۔ان دکھوں کا سبب انسانی خواہشات اور تمنائیں ہیں۔(۳)۔خواہشات اور آرزؤں کا خاتمہ دکھوں سے نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔(۴)۔دکھوں کے خاتمے کا راستہ آٹھ منازل پر مشتمل ہے۔(۱) درست نظر (۲) درست ارادہ (۳) درست کلام (۴) درست عمل (۵) درست روزگار (۶) درست کوشش (۷) درست دھیان اور (۸) درست مراقبہ۔

گوتم بدھ نے پانچ اخلاقی اصول بھی بیان کیے۔(۱) کسی جاندار کو ہلاک نہ کریں (۲) جو آپ کو دیا نہیں گیا وہ ہرگز نہ اٹھائیں (۳) جھوٹ نہ بولیں (۴) کوئی نشہ آور چیز استعمال نہ کریں (۵) بدکاری نہ کریں اور پاکبازی اختیار کریں۔☆(1) گوتم بدھ کی یہ تمام تعلیمات ہمیں ''دہشت گرد سے گوتم بدھ کی ملاقات، قصّہ انگلی مالا کا'' میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔گوتم بدھ ۴۸۳ ق۔م میں دنیا سے چلا گیا۔جب کہ جین مت مذہب کے بانی مہاویر کی تعلیمات میں بھی ہمیں اہنسا یعنی عدم تشدد کے نظریے کا پرچار ملتا ہے۔

آصف فرخی نے ''دہشت گرد سے گوتم بدھ کی ملاقات، قصہ انگلی مالا کا'' یہ اردو ترجمہ ستیش کمار کے لندن سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والے انگریزی ایڈیشن سے کیا جس کو کافی پذیرائی نصیب ہوئی۔ آصف فرخی محققین کی اس بات سے متفق نظر آتے ہیں کہ ''قصہ انگلی مالا کا'' پالی زبان میں بدھ مت مذہب کے مقدس ویدوں میں درج ملتا ہے۔ ''فلسفے کی مختصر تاریخ'' کے مصنف اکبر لغاری اور ''ہندوستانی فلسفہ'' کے مصنف موھن لال ماتھر کی تحقیق کے مطابق گوتم بدھ کی تعلیمات کے زیادہ تر تحریری شواہد پالی زبان میں ہی ہیں چناں چہ قیاس یہی ہے کہ ''قصہ انگلی مالا کا'' بھی ان ہی تعلیمات کا حصہ ہوگا۔ بنیادی طور پر ''قصہ انگلی مالا کا'' میں ایک دہشت گرد انگلی مالا، راجہ پاسندی اور گوتم بدھ کی ملاقات اور ملاقات کے دوران دیئے جانے والے عدم تشدد سے متعلق سبق کے نتیجے میں انگلی مالا اور راجہ پاسندی کی کایا کلپ ہونے کو دکھایا گیا ہے۔

آصف فرخی نے قصے کو اردو زبان کا روپ دیتے ہوئے ستیش کمار کے انگریزی ایڈیشن کے قصے کی اصل فضا اور روح کو زندہ رکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ قصہ انگلی مالا کا ہے اور انگلی مالا کی روایت بھی بدھ جی سے منسلک پالی زبان کے قدیم قصوں میں ملتی ہے۔ پالی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی، ایک بار اور پھر کئی بار۔ اس قصے کو اردو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے میں نے ستیش کمار کے بیان کو بنیاد بنایا ہے۔''(۲)

آصف فرخی نے اس قصے کو بیان کرنے کا مقصد موجودہ حالات کو گردانا ہے اور دہشت گردی کو اس دور کا اہم مسئلہ قرار دیا ہے۔ وہ بھی اسی نظریے اور سوچ کے قائل ہیں کہ دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے اور دیرپا امن کے قیام کے لیے بات چیت کا راستہ اہم اور درست ہے۔ طاقت کے استعمال سے مسائل اور دہشت گردی کم نہیں ہوتی بل کہ بڑھتی ہے۔ وہ دور حاضر میں کہانی اور قصے کی زبان کو دہشت گردی کے خاتمے اور اچھے خیالات کی ترویج کا اہم ذریعہ مانتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کہانی کے ذریعے معاشرتی برائیوں اور بیماریوں کے تدارک کا راستہ دکھایا ہے۔

آصف فرخی نے مترجمہ کاوش کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں انتظار حسین کا لکھا گیا دیباچہ ہے جس میں انہوں نے جہاں ایک طرف آصف فرخی کے فن اور کاوش کو سراہا ہے تو دوسری جانب انگلی مالا کے قصے کو لچنڈ بھی قرار دیا ہے۔(۳) انتظار حسین کے دیباچے کے بعد ''حرفِ چند'' کے عنوان سے اس قصے کے بارے میں سیتہ پال آنند کے خیالات کا اظہار دیا گیا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ 'عادی مجرم' کی اصطلاح انگریزوں کے عہد برصغیر پاک و ہند میں گھڑی گئی۔ مزید بتاتے ہیں کہ دہشت گرد پیدا نہیں ہوتے، برین واشنگ ''اذہان سازی'' سے بنائے جاتے ہیں جو چین بنائی جا سکتی ہے، اس کی تجسیم بھی لائی جا سکتی ہے۔(۴) ''کہانی سے پہلے'' کے عنوان سے لکھے گئے مقدمے میں مترجم آصف فرخی نے دور حاضر میں دنیا کو درپیش دہشت گردی جیسے چیلنج، اس کے اسباب اور گوتم بدھ کے نظریہ عدم تشدد پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''کہانی جتنے بھی روپ دھار لے، اس کے عین قلب میں واقع وہ انسانی اقدار کا جوہر آج بھی ہم سے بہت کچھ کہتا سنتا ہے۔ دہشت گردی کے اس شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، کیا ہم کہانی کی بات، آدمی کی بات سننے کے لیے تیار ہیں؟ کیا انگلی مالا کی گردن سے خون آلود انگلیوں کی مالا اتار کر کہانیوں کی مالا پہنائی جا سکتی ہے؟ کیوں نہ ہم انگلی مالا کو کہانی مالا میں بدل دینے کی کوشش کر کے دیکھ لیں؟ یہ ہمارے اس خون آلود دور کا تقاضا ہے جس میں کہانیاں کم پڑ گئی ہیں اور انگلی مالا بڑھتے جا رہے ہیں۔''(۵)

مترجم آصف فرخی نے ستیش کمار کے انگریزی زبان کے ایڈیشن کے تعارف، پیش لفظ اور دیباچے کا ترجمہ بھی دیا ہے۔ انگریزی زبان کے ایڈیشن کے دیباچے میں ایلن ہنٹ بڈیز نے عدم تشدد کے نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے انگلی مالا کے کردار کی کایا کلپ ہونے کو مثالی قرار دیا ہے اور ان خیالات کا اظہار کیا:

> ''آج کی دنیا میں انگلی مالا کی تبدیلی سے متاثر ہو کر جیل کے قیدیوں کے لیے ایسے تدریسی پروگرام بنائے گئے ہیں جو

یورپ، آسٹریلیا اور ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رہنے والے قیدیوں کو دھیان کا عمل سکھاتے ہیں۔ انگلی مالا کے اندر برپا ہونے والی تبدیلی اس امید کو جنم دیتی ہے کہ آج کے دہشت گرد بھی _ چاہے وہ مغرور قاتل ہوں جن کو کوئی ملک اپنانے کے لیے تیار نہیں یا حکومت کے معزول سربراہان __ اس خوف کا سامنا کر سکتے ہیں جو دل کے اندر موجود ہے اور اس خوف کا سامنا کرنے کے بعد خود بھی شفا پائیں گے اور دوسروں کی مدد بھی کریں گے۔''(۶)

دل کے اندر کا خوف کسی بھی انسان کے کردار اور شخصیت میں مثبت تبدیلی کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس خوف کو بیدار کرنے کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور کارفرما ہوتا ہے جس طرح کے انگلی مالا کے کردار کی تبدیلی کے پیچھے گوتم بدھ کے نظریات کارفرما نظر آتے ہیں۔ انگریزی ایڈیشن کا تعارف اور پیش لفظ خود ستیش کمار نے تحریر کیا ہے جن میں انہوں نے حالاتِ حاضرہ میں دہشت گردی کے مسئلے، اس کے اسباب، تدارک کے راستے اور گوتم بدھ کے نظریہ عدم تشدد پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے یہ باور کروانے کی کوشش بھی کی ہے کہ تشدد پر ہمارا ایمان ہی تمام مسائل کی بنیادی وجہ ہے وہ لکھتے ہیں:

''درحقیقت اصل مسئلہ دہشت گردی نہیں ہے بلکہ تشدد پر ہمارا ایمان ہے۔''(۷)

قصے کی فضا ہندوستانی رنگ لیے ہوئے ہے۔ پالی زبان کی روایات میں موجود قصے اور ستیش کمار کے بیانیے میں یہ ہی بنیادی فرق ہے کہ پالی زبان کی روایات میں انگلی مالا ایک برہمن خاندان کا سپوت جبکہ ستیش کمار کے بیانیے میں اچھوت خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بدھ عقیدے کے مطابق اس قصے کے کلاسیکی روپ میں انگلی مالا بھی جنم کے حساب سے اونچی ذات کا ہے، برہمن گھرانے کا __ اس کے باپ کا نام گگا اور ماں کا نام منتانی درج ہے۔ مگر جیسا کہ زبان روایت میں عام طور سے ہوتا آیا ہے، اس قصے کے بہت سے روپ ہیں.... اس قصے کی جو شکل میں نے بچپن میں اپنی ماں سے سنی اس کے مطابق انگلی مالا اچھوت ہے۔ وہ تفریق میں حقارت کا شکار ہوتا ہے جس کی وجہ سے باغی بن جاتا ہے۔ وہ طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرتا ہے۔''(۸)

ستیش کمار کی اس ترمیم کا مقصد قصے کو دورِ حاضر کے حالات و واقعات کا ترجمان اور عکاس بنانا تھا۔ خاص طور پر کتاب کے انگریزی ایڈیشن کے دیباچے میں انہوں نے دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ اور اس کے تدارک کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات کا جو ذکر کیا ہے اس سے ان کی اس کاوش کا مقصد بخوبی عیاں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ستیش کمار دہشت گردی کے مسئلہ کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کے حق میں نظر آتے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے گوتم بدھ کے نظریہ عدم تشدد کو فروغ دینے کے لیے، گوتم بدھ اور انگلی مالا کے قصے کو پیش کیا ہے تا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو یہ پیغام دیا جا سکے کہ دہشت گردی سے چھٹکارا اور امن کا قیام گولہ بارود کی بجائے نفرت کا جواب محبت سے دینے میں چھپا ہوا ہے لیکن ایسا کرنے کے لیے کسی گوتم بدھ کا ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ ''انگلی مالا کی کہانی'' کے عنوان سے دیئے گئے انگریزی ایڈیشن کے تعارف میں ستیش کمار لکھتے ہیں:

''اس کہانی کو لکھنے کا میرا مقصد دہرا ہے۔ ایک تو اس بات کو ظاہر کرنا کہ ایک اور راستہ بھی ہے، زیادہ موثر، کہ جس پر چل کر دہشت گردی پر قابو پایا جا سکتا ہے، بجائے اس کے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور آگ کا جواب آگ سے۔ اور دوسرا مقصد یہ کہ میں جس حد تک بدھ فلسفے کو سمجھ سکا ہوں اس کا تعارف ایک قصے کے ذریعے کرایا جا سکے۔''(۹)

ستیش کمار انگریزی ایڈیشن کے پیش لفظ ''دہشت گردوں سے بات چیت'' میں ۱۱ ستمبر کے واقعات اور اس کے بعد دنیا بھر میں دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد ساری دنیا کی سیاست پر خوف اور عدم تحفظ کا غلبہ ہو گیا۔ بین الاقوامی دہشت گردی ہمارے

دور پر آسیب بن کر مسلّط ہو گئی ہے۔لیکن اس کے باوجود سیاسی رہ نمارات دن ایسی پالیسی اور عملی منصوبے تیار کرنے میں مصروف ہیں جو دہشت گردی کی علامات سے نمٹ سکتی ہیں، اس کے اسباب سے نہیں۔ان کو یہ امید ہے کہ فوج اور پولیس کی طاقت سے اور دوسرے حفاظتی اقدامات سے فتح مندی کا وقتی احساس ہوسکتا ہے، لیکن طویل مدت میں یہ دہشت گردی کسی نہ کسی شکل میں دوبارہ سر اٹھائے گی۔''(۱۰)

آصف فرخی نے کتاب کے دوسرے حصے میں ''قصہ انگلی مالا کا'' پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جب کہ کتاب کے آخری حصے میں ''قصہ انگلی مالا'' کی روایت سے وابستہ تاریخی اور تحقیقی حقائق بیان کیے ہیں۔''قصہ انگلی مالا'' سات ذیلی عنوانات کے تحت بل ترتیب تکمیل پاتا ہے۔

(۱) بدھ اور دہشت گرد آمنے سامنے، (۲) راجہ بدل گیا، (۳) خوف سے آزادی، (۴) سچا، سادہ من، (۵) بدلے کی آگ
(۶) معافی کی فتح، (۷)۔موت سے زندگی کی طرف۔

''قصہ انگلی مالا'' کے پہلے حصے ''بدھ اور دہشت گرد آمنے سامنے'' کے آغاز میں گوتم بدھ اپنے چیلوں کو جیت کنج چھوڑ کر، اپنی چیلی نندنی کے شہر ساؤتھی آتے ہیں۔گوتم بدھ کو ساؤتھی شہر کی گلیاں اور بازار ویران وسنسان اور دہشت کی علامت بنے نظر آتے ہیں۔جب وہ اپنی چیلی نندنی کے گھر جاتے ہیں تو وہ ان کے سامنے سارا ماجرا بیان کرتی ہے کہ کس طرح انگلی مالا نے خون ریزی اور قتل وغارت گری سے شہر میں دہشت پھیلا رکھی ہے اور لوگ گھروں میں محصور ہونے پر مجبور ہوگئے ہیں۔نندنی، گوتم بدھ سے کہتی ہے:

''وہ انسانی انگلیوں کی مالا گلے میں پہنتا ہے اس لیے اس کا نام انگلی مالا مشہور ہوگیا۔وہ بے رحم جلاد ہے۔وہ لوگوں کی انگلیاں کاٹ ڈالنے کے لیے ان کی جان لے لیتا ہے۔وہ بہت طاقت ور ہے اور چالاک ___ وہ بہت مکار ہے۔اس نے شہر کے شہر اور گاؤں کے گاؤں کا صفایا کر ڈالا۔سبھی اس سے ڈرتے ہیں۔''(۱۲)

گوتم بدھ تمام ماجرا سننے کے بعد انگلی مالا کی تلاش میں جنگل کی طرف عازم سفر ہوتے ہیں۔جنگل میں گوتم بدھ اور انگلی مالا کا آمنا سامنا ہوتا ہے دونوں کے درمیان تشدد اور عدم تشدد کے نظریات پر طویل مکالمہ ہوتا ہے۔گوتم بدھ کو انگلی مالا دہشت گرد بننے کی وجوہات بتاتا ہے کہ کس طرح اس کی نچلی ڈوم اور اچھوت ذات کے لوگوں کے ساتھ اونچی ذات کے لوگوں کا سلوک بہت برا تھا۔جس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے دہشت گردی اور خون خرابے کا راستہ اختیار کیا اور اسے کس طرح اس راستے پر ایک جادوگر نے لگایا جس نے طاقت کا منبع تلوار کو قرار دیا۔انگلی مالا کہتا ہے:

''پھر مجھے ایک جادوگر ملا، طاقت کا مظاہرہ کرنے والا اس نے کہا کہ طاقت تلوار کی نوک پر اپنا ٹھکانا بناتی ہے.... اس نے کہا کہ اگر تم نے اس تلوار سے ایک سو افراد کی جان لی اور ایک ہزار انگلیوں کی مالا اپنی گردن میں پہن لی تو پھر تم دوسروں کو اپنی مرضی کے تابع کرسکو گے اور ساری دنیا پر تمھارا حکم چلے گا۔''(۱۳)

یہاں یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں ایسے شیطان صفت لوگوں کی کمی نہیں جو سیدھے اور نیکی کے راستے سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو مزید بھٹکا دیتے ہیں اور برائی اور گناہ کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔جب کہ گوتم بدھ جیسے مسیحا بھی اسی زمین پر موجود ہیں جو انسانوں کی راہ نمائی کے لیے ہر دم موجود ہوتے ہیں۔گوتم بدھ، انگلی مالا کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اصل طاقت برائی کے بدلے میں اچھائی کو عام کرنے اور نفرت کے جواب میں محبت اور پیار بانٹنے میں ہے۔گوتم بدھ اپنے راج کمار کے منصب اور عیش پرست زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور نروان حاصل کرنے تک کے واقعات انگلی مالا کو سناتے ہیں۔اور وہ واقعہ بھی سناتے ہیں جس کے ذریعے ان کی اپنی ذات کی کایا کلپ ہوئی اور ایک راج کمار سے سادھو بن گئے۔گوتم بدھ انسانی خواہشات کو دکھوں کا سبب بتاتے ہیں۔انگلی مالا، گوتم بدھ کے نظریات اور رویے سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی کایا کلپ ہوجاتی ہے اور وہ بدھ بھکشو بن جاتا ہے۔گوتم بدھ اس کا نیا نام اہمسا یعنی 'عدم تشدد چاہنے والا' رکھتے ہیں۔گوتم بدھ، انگلی مالا کے سامنے کنول کے پھول کی مثال دیتے ہیں جو کیچڑ میں رہ کر نمو پاتا ہے لیکن پھر بھی دوسروں کی مسرتوں اور خوشیوں کا سبب بنتا ہے۔انتظار حسین، انگلی مالا کی کایا کلپ ہونے کے بارے میں لکھتے

ہیں:

''مگر اس انگلی مالا کی تو مہاتما بدھ کے اثر میں آ کر ایسی کایا کلپ ہوئی کہ وہ دہشت گردی جون سے گلوخلاصی حاصل کر کے بدھ بھکشو بن گیا اور پھر دہشت گردی کے خلاف ایک طاقت بن کر ابھرا۔ مہاتما بدھ نے اس کی کایا کلپ کے لیے کون سا نسخہ استعمال کیا تھا۔ وہی جوان کی تعلیمات کا حصہ ہے کہ تشدد کا جواب تشدد نہیں ہے۔ اس جواب سے تو تشدد اور زور پکڑتا ہے۔ نفرت کا توڑ نفرت نہیں محبت ہے۔'' (۱۴)

قصہ انگلی مالا کے دوسرے حصے ''راجہ بدل گیا'' میں ساؤتھی کے راجہ پاسندی کے انگلی مالا کی تلاش میں نکلنے، گوتم بدھ سے ملنے، گوتم بدھ اور راجہ پاسندی میں انگلی مالا کی معافی سے متعلق مکالمے، انگلی مالا کو بدھ بھکشو کے روپ میں لوگوں کو درس دیتے دیکھ کر راجہ کے بے ہوش ہونے اور پھر انگلی مالا کا راجہ کی دیکھ بھال کرنے اور اس کے نتیجے میں راجہ کی کایا کلپ ہونے تک کے واقعات کا ذکر آیا ہے۔ راجہ پاسندی، انگلی مالا کی کایا کلپ سے متاثر ہو کر کہتا ہے:

''جب بدھ جی نے تمھارا ذکر کیا تو مجھے اعتبار نہ آیا تھا اب میں نے دیکھا اور جان لیا کہ تمھاری کایا کلپ ہو چکی ہے۔'' (۱۵)

راجہ پاسندی کی کایا کلپ ہونے کے بعد وہ بے رحمی اور غصے کو چھوڑ کر معاملات کو محبت اور رحم کے جذبات کے ذریعے حل کرنے کی جانب راغب ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ، راجہ کو ایک تالاب کے کنارے لے جاتے ہیں اور اس کے سامنے بھی کنول کا پھول رکھ کر کہتے ہیں:

''اے راجہ کنول کے پھول کا کوئی دشمن نہیں ہوتا.... کنول کا پھول سب کو خوش رکھتا ہے۔ آدمی بھی کنول کے پھول کی طرح کیوں نہیں ہو سکتا؟.... غصے کو غصے سے ختم کیسے کیا جا سکتا ہے؟.... نفرت کا اگر خاتمہ ممکن ہے تو صرف محبت سے بھروسا ہی ڈر کو مٹا سکتا ہے۔'' (۱۶)

راجہ پاسندی انگلی مالا کے کردار کے بدلنے پر یقین کر لیتا ہے اور خود کو بھی بدل لیتا ہے یعنی راجہ بھی گوتم بدھ کے عدم تشدد کے نظریے پر ایمان لے آتا ہے۔ ''خوف سے آزادی'' کے عنوان سے آنے والے ''قصہ انگلی مالا'' کے تیسرے حصے میں انگلی مالا بدھ بھکشو بننے، اہمسکا کا نام پانے اور راجہ پاسندی سے ملاقات کے بعد، گوتم بدھ سے اجازت لے کر ساؤتھی شہر جاتا ہے تا کہ ان لوگوں کے خوف سے آزادی حاصل کر سکے جو اس کے ظلم کا شکار ہوئے۔ ساؤتھی کے لوگ انگلی مالا کو بدھ بھکشو کے روپ میں بھی پہچان لیتے ہیں اور اس پر انتقاماً تشدد کرتے ہیں جس سے انگلی مالا شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ کی چیلی نندنی، اس کی جان بچا کر اسے گوتم بدھ کے پاس جیت کنج پہنچا دیتی ہے۔ قصے کے چوتھے حصے ''سچا، سادہ من'' میں گوتم بدھ اور اس کے چیلے انگلی مالا کی دیکھ بھال کرتے ہیں جس کے بعد وہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ یہاں زندگی سے دکھوں کے خاتمے کے لیے آٹھ طریقوں کے راستے کا بھی بتاتے ہیں۔ وہ نندنی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

''میں نے دکھ اٹھایا ہے اور مجھے اس کا براہ راست تجربہ ہے۔ اسی طرح مجھے دکھ کے خاتمے کا بھی براہ راست علم ہے جو آٹھ طریقوں والے راستے پر چل کر حاصل ہوتا ہے ___ آٹھ طریقے میں یہ باتیں آتیں ہیں ___ صحیح نظر، صحیح ارادہ، صحیح کلام، صحیح عمل، صحیح روزگار، صحیح کوشش، صحیح دھیان اور صحیح توجہ اور ان سے ہم آہنگی، تکمیل اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔'' (۱۷)

زندگی میں ہم آہنگی، تکمیل اور بصیرت کو گوتم نے ضروری خیال کیا ہے۔ گوتم بدھ سادہ زندگی گزارنے پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بھی عیش پرستی اور آسائشوں کو چھوڑ کر سادگی اور درویشی سے بھرپور زندگی کا رخ کیا۔ وہ باہر کی سادگی کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اور جذبات کی سادگی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ نندنی سے کہتے ہیں:

''اپنے اندر کی زندگی کو سادہ بناؤ۔ اپنے آپ کو پسند ناپسند، خواہشات اور طلب سے خالی کر لو۔'' (۱۸)

قصے کے پانچویں حصے ''بدلے کی آگ'' میں انگلی مالا کی مار پیٹ کرنے والے ساؤتھی کے لوگ، انگلی مالا کے بارے میں اطلاع دینے

اورانعام حاصل کرنے کے لالچ میں راجہ پاسندی کے دربار میں پہنچتے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف انعام کا مطالبہ کرتے ہیں تو دوسری طرف انگلی مالا، گوتم بدھ اورنندنی کوسزا دینے کی بات بھی کرتے ہیں۔ راجہ پاسندی مجرموں کو طاقت کی نسبت زبان سے بدلنے کے قائل ہو چکے ہیں اور وہ آنے والے لوگوں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

''انگلی مالا دہشت گرد سے بدل کر بھکشو بن گیا۔ میں بھی سخت سزائیں دینے والے ظالم کی بجائے رحم دل راجہ بن گیا۔''(۱۹)

راجہ پاسندی انصاف کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لیے انگلی مالا، گوتم بدھ اور نندنی کو عوام کی عدالت میں بلانے کا دعدہ کرتے ہیں اور وقتِ عدالت مقرر کر دیتے ہیں۔ چھٹے حصے ''معافی کی فتح'' میں عدالت لگتی ہے۔ انگلی مالا کے دہشت گردرویہ سے متاثر ہونے والے لوگ، انگلی مالا کے جرائم کی روداد بیان کرتے ہیں۔ انگلی مالا ان جرائم کا اعتراف کرتا ہے۔ اپنی کایا کلپ ہونے میں گوتم بدھ کے نظریات اور کردار کی بابت لوگوں کو بتاتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ دہشت گرد کن وجوہات کی وجہ سے بنا۔ راجہ پاسندی کی عدالت میں جین مت مذہب کے بانی مہاویر نظریہ عدم تشدد سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ مہاویر بتاتے ہیں کہ تشدد صرف جسمانی ہی نہیں ہوتا بل کہ تشدد خوف، ذات پات، دوسروں کے استحصال، دوسروں کو برا بھلا کہنے سے لے کر نفسیاتی اور سماجی تشدد اور تضاد تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرے سے ہر قسم کے تشدد کا خاتمہ ضروری ہے۔ مہاویر کے کردار کو یہاں قصے میں لانے کا مقصد یہ بتانا دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی مذہب یا مذہبی گروہ تشدد کے نظریے کے حق میں نہیں ہے۔ یہاں گوتم بدھ بھی عدم تشدد سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ گوتم بدھ اور مہاویر دونوں اہنسا یعنی عدم تشدد کے نظریہ پر متفق دکھائے گئے ہیں۔ یہاں سجاتا کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے جس کے شاعر شوہر کو انگلی مالا نے قتل کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ بیوہ ہوئی تھی اور اس کا بچہ باپ کے سایے سے زندگی بھر کے لیے محروم ہو کر یتیم بن گیا لیکن وہ انگلی مالا کے بدلے ہوئے کردار کو دیکھ کر اسے معاف کرنے کا اعلان کرتی ہے اور کہتی ہے:

''میں سوچتی ہوں کہ میرے پتی ہوتے تو وہ کہتے، انگلی مالا سے ان لوگوں کو جو حوصلہ ملے گا جو جرم کر کے قید خانوں میں ہیں یا لوگوں کی نفرت کے ڈر سے کہیں چھپ گئے ہیں۔ انگلی مالا سے یہ سبق ملے گا کہ معافی، توبہ اور نجات سب کے لیے ہے۔''(۲۰)

سجاتا کے صبر اور برداشت کو دیکھ کر تمام لوگ بھی انگلی مالا کو معاف کر دیتے ہیں یوں عام لوگوں کی بھی کایا کلپ ہوتی دکھائی گئی ہے۔ کہانی کے آخری حصے ''موت سے زندگی کی طرف'' میں انگلی مالا کے ہاتھوں، جنگل میں ایک عورت کے ہاں دوران زچگی خوبصورت بچے کی پیدائش ہونے کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ عورت جنگل میں بے یارومددگار پڑی ہوئی تھی۔ انگلی مالا نے گوتم بدھ سے اجازت لے کر اس عورت کی دیکھ بھال کی، جس کے بعد وہ عورت تندرست ہوگئی۔ اصل میں اس واقعہ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ وہی انسان جو انگلی مالا کے روپ میں دہشت گرد بن کر لوگوں کی زندگیوں کو موت کے منہ میں دھکیلتا تھا اب ایسا بدلا کہ اہمسکا بن کر لوگوں کو موت کے منہ سے بچا کر زندگی کی طرف لانے لگا۔ گوتم بدھ نے کہانی کے اس حصے میں تشدد کی ذہنی، لفظی اور جسمانی قسمیں بھی بتائی ہیں۔

چناں چہ ''قصہ انگلی مالا'' کے تمام واقعات، گوتم بدھ کے نظریات اور حالات حاضرہ کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاشرے سے دہشت گردی اور دوسری برائیوں کا خاتمہ اور سدِ باب تشدد کے نظریہ پر عمل پیرا ہونے کی بجائے نظریہ عدم تشدد کو اپنا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں محبت، اخلاقی اقدار اور مساوات کو فروغ دے کر بہت سی معاشرتی برائیوں اور بیماریوں کا تدارک ممکن ہے۔ معاشرے سے عدم توازن اور طبقاتی انتشار کا خاتمہ بھی انتہائی ضروری ہے۔ 9/11 کے بعد عالمی طاقتوں نے دہشت گردی کے خاتمے اور تدارک کے لیے تشدد اور طاقت کے ذریعے دہشت گردوں کو کچلنے کا جو راستہ اپنایا وہ دنیا میں امن وامان کے قیام کا سبب نہ بن سکا بل کہ اس سے دہشت گردی کی شدت میں اضافہ ہوا۔ چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے اور دنیا میں دیرپا امن کے قیام کے لیے گوتم بدھ اور مہاویر کے نظریہ عدم تشدد کی تقلید کی جائے اور ان دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کو جن کی طبیعت اور فطرت میں انگلی مالا کے کردار کی طرح محبت، پیار اور احساس کی بیداری سے کایا کلپ ہونے کی خصوصیت

موجود ہے ان کی کایا کلپ کی جائے اور انہیں اہمسا یعنی عدم تشدد پر یقین رکھنے والے انسانوں میں تبدیل کیا جائے۔ان کے نظریات اور سوچ کے دھاروں کو بدل کر ہی حقیقی تبدیلی کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ جہاں عام انسانوں اور دہشت گردوں کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے وہاں عالمی طاقتوں اور حکمرانوں کو بھی اپنی سوچ اور جارحانہ رویوں کو تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔''قصہ انگلی مالا'' میں جہاں انگلی مالا کی کایا کلپ ہونا مثبت نتائج کا حامل ہے وہاں ساؤتھی کے راجہ پاسندی کی کایا کلپ ہونا بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱)۔اکبر لغاری۔فلسفے کی مختصر تاریخ۔سندھی سے ترجمہ شاہد حنائی۔فیصل آباد: مثال پبلشرز، اشاعت دوم ۲۰۱۳ء۔ص ۲۱۵ تا ۲۲۰۔

(۲)۔آصف فرخی۔دہشت گرد سے گوتم بدھ کی ملاقات، قصہ انگلی مالا کا۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲،

(۳)۔ایضاً، ص ۵، (۴)۔ایضاً، ص ۱۰، (۵)۔ایضاً، ص ۱۲۰، (۶)۔ایضاً، ص ۱۶،

(۷)۔ایضاً، ص ۲۶، (۸)۔ایضاً، ص ۱۷، (۹)۔ایضاً، ص ۱۸، (۱۰)۔ایضاً، ص ۱۹،

(۱۲)۔ایضاً، ص ۳۰، (۱۳)۔ایضاً، ص ۳۶، (۱۴)۔ایضاً، ص ۶،

(۱۵)۔ایضاً، ص ۵۰، (۱۶)۔ایضاً، ص ۴۹، (۱۷)۔ایضاً، ص ۶۵، (۱۸)۔ایضاً، ص ۶۷،

(۱۹)۔ایضاً، ص ۷۳، (۲۰)۔ایضاً، ص ۸۵،

☆☆☆

جرجی زیدان ایک مظلوم مصنف

عبدالرحمٰن، شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

جرجی زیدان جدید عربی ادب میں ان عظیم ناموں میں سے ایک ہیں جس کو دنیا چاہ کر بھی نہیں بھلا سکتی ہے اور جس نے دنیا کو بتلا دیا کہ انسان جنموں سے نہیں بلکہ کرموں سے بڑا بنتا ہے اور اپنے پیچھے مختلف موضوعات پر مشتمل کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑنے والا یہ شخص تاریخ ادب عربی کی کتابوں میں بمشکل ہی نظر آتا ہے خود اپنی کتاب ''تاریخ آداب اللغہ العربیہ'' جو کہ تاریخ ادب عربی پر لکھی گئی ایک مفصل کتاب ہے اس میں بھی انھوں نے کہیں بھی اپنا تذکرہ نہیں کیا ہے اگر تدوین محمد عبدالغنی الحسن کے ہاتھوں سے تکمیل کو نہ پہنچی ہوتی تو شاید اس میں بھی ان کا مختصر سا تعارف نہ ملتا اگر چہ انھوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں صرف عرب ادباء کا تعارف نہیں کرایا ہے بلکہ اس میں ہر اس ادیب تک پہنچنے کی پوری کوشش کی ہے جس کا عربی زبان و ادب سے شغف رہا ہو اور بطور ارث اپنی کچھ یادگار شاہکار کو آنے والوں کے لئے بھلے ہی چھوڑا ہو خواہ وہ زمین کے کسی بھی گوشہ میں رہ رہا ہو یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی کتاب میں بعض ہندوستانی ادباء کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کیا یہاں یہ سوال اٹھانا صحیح اور جائز ہوگا کہ چونکہ زیدان ایک مسکین گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اسلاف میں کوئی ایسا بڑا نام نہ تھا جس کی بنیاد پر ادباء کی توجہ کا مرکز بن سکتے یا پھر مذہبی اختلاف ادباء کا ان کی طرف سے صرف نظر خاص وجہ بنی یا خود ان کا اختلافی باتوں میں پڑنا اور اس میں تشویہ اور تموتح کر کے لوگوں کے سامنے پروسنا تھا۔ اس طرح کی بہت سی باتیں ممکن ہو سکتی ہیں جس پر گفتگو کرنے کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے جس پر کبھی اور بحث کی جائیگی۔

جرجی زیدان طب وصیدلہ کی اعلی تعلیم کے لئے وطن اور اہل وطن کو خیر آباد کہہ دیا، والدین کی رفاقت کو خوشی خوشی قبول کر لیا، قبل اس کے وہ ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے تھے، چند سکے اپنے ایک پڑوسی سے بطور مستعار لئے اور سمندر کے دشوار کن راستہ پر نکل پڑے اس شوق کے ساتھ کہ مصر میں اعلی تعلیم حاصل کر کے ایک حاذق طبیب بن کر اپنے شہر بیروت میں فقراء اور مساکین کا علاج کریں گے۔ لیکن قدرت نے ان کے حق میں کچھ اور ہی سوچ رکھی تھی اور ان سے وہ کام لینا چاہتی تھی جس کا انتخاب کروڑوں میں کسی ایک کا ہوتا ہے چنانچہ جب وہ سمندر کا دشوار راستہ طے کر کے مصر کے قدیم شہر اسکندریہ پہنچے تو وہاں ان چیزوں کا مشاہدہ کیا جسکو کوئی بھی انسانیت سے محبت کرنے والا نہ کرنا چاہے گا چہ جائیکہ ایک بچہ، ہر طرف تباہی اور ویرانی کا منظر تھا عالیشان عمارتیں ملبہ میں تبدیل دکھیں یہ خوفناک منظر جرجی زیدان کی آنکھیں دیکھ نہ سکیں اور جلد ہی وہاں سے شہر قاہرہ کا رخ کیا۔

جرجی زیدان قاہرہ تو پہنچ گئے لیکن یہاں کی زندگی ان کے لئے کم چیلنج بھری نہ تھی یہاں تک کہ تعلیم بھی ہاتھ سے جاتی رہی، جس کے لئے سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہوئے تھے تھوڑا سا پیسہ جو ختم ہونے کو تھا غربت اور اجنبیت کی زندگی میں کسی طرح کے سہارے کی امید نہ تھی، گھر لوٹنا ان کے لئے باعث عار تھی، زبوں حالی گھر کو بلا رہی تھی جبکہ غیرت کسی طرح گھر لوٹنے کو راضی نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ صبح سویرے نوکری کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتے اور دیر رات گھر واپس آتے، کئی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا نوکری ملنے کو تیار نہیں تھی اور وہ اس سے مات کھانے کو بالآخر نوکری کو ہی ان کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا اور ایک اخبار ''الزمان'' میں ملازمت مل گئی، یہاں یہ بتا تا چلوں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب مصر پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط تھا اور وہاں سے شائع ہونے والے تمام اخبار و رسائل کی اشاعت پر پوری طرح پابندی تھی یہی ایک تنہا اخبار تھا جو شائع ہو رہا تھا اور جس کی ادارت کی باگ ڈور ایک نصرانی کے ہاتھ میں تھی۔ دراصل یہاں یہ بتلانا مقصد نہیں ہے کہ چونکہ اس اخبار کی ادارت ایک نصرانی کر رہا تھا اور زیدان بھی ایک ''کیتھولک'' نصرانی تھے اس لئے اس اخبار میں کام کرنے کو مل گیا بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس غریب الوطنی میں کوئی تو ان کا سہارا بنا کیونکہ ابھی تو وہ ایک بچے تھے مذہب و مسلک کی پیچیدگیوں اور الجھنوں سے بہت دور فقر و مسکنت کی گہری کھائی میں پھنسے تھے اور ان کی عقل اس بات سے آگے سوچنے کے قابل نہ تھی کہ کیسے دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو چہ جائیکہ وہ مذہب و مسلک کی باتوں میں پڑتے۔

زیدان ایک خالص عرب تھے ان کو اپنی سرزمین جان و دل سے پیاری تھی اس کے لئے وہ جان دے بھی سکتے تھے اور لے بھی سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ اثر ہمیں بعد میں ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور یہی وہ محرک کار تھے جس کی وجہ سے اپنے عرب اور عربوں کی تاریخ اور ان کے انساب اور زبان کی تاریخ کو جمع و تدوین کرنے میں بہت عرق ریزی کی اور پوری تحقیق و تدقیق کے بعد لوگوں کے سامنے پیش کیا بالخصوص ان کی تہذیب پر تو ایسا علمی کام پیش کیا جس کو بعد کے ادوار تک کوئی نہ پیش کر سکا اگر علماء کے مابین کچھ اختلاف نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج یہ کتاب متفقہ طور پر مصر کی تمام یونیورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہوتی۔ جرجی زیدان کی تعلیم طب سے دوری ان کے علم سے مہجوری کا سبب نہ ہوئی بتاتا چلوں کہ یہ وہی بچہ ہے جس کا بچپن کبھی مدرسہ و مطبخ کے درمیان بیتا تو کبھی سکاف و کتاب کے مابین صبح اٹھتے اور امراء کے بچوں کو اچھے لباس میں ملبوس اچھے اسکولوں کی طرف جاتے دیکھتے تو رشک بھری نگاہوں سے دیر تک ان کو تاکتے تھے اور دل ہی دل میں یہ دعا کرتے کہ کاش کبھی وہ دن زیدان کی زندگی میں بھی آئے کہ وہ بھی ان کی طرح اچھے اسکولوں کو جائیں جرجی زیدان کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کا یہ غم بار بار چھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

زیدان اگر چہ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل نہ کر سکے لیکن انھوں نے اپنی کاوش اور کثرت مطالعہ سے بلندی کا وہ مقام حاصل کر لیا جہاں سے نگاہیں واپس آجاتی ہیں اور وراثت میں وہ ذخیرہ چھوڑا جس کو ایک اکیڈمی بمشکل پورا کر سکتی ہے۔ زیدان نے صحیح معنوں میں عربی میں تاریخی ناول کی طرح ڈالی جو آگے چل کر خوب پھلی پھولی چونکہ ان کا اصل میدان صحافت اور تاریخ نگاری تھی جس کی وجہ سے وہ ناول کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور اس کے پورے اصول وضوابط پر پابندی سے عمل نہ کر سکے ورنہ عربی کا ناول بہت پہلے اپنی مکمل صورت میں آچکا ہوتا۔ زیدان نے ناول کو کیوں لکھنا شروع کیا اور تاریخی ناول کو کیوں انتخاب کیا اس کے لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی یہ وہ اشکال وسوالات ہیں جس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے اس پر کبھی اور روشنی ڈالی جائے گی۔

جرجی زیدان نے تاریخ وتمدن زبان وادب اور اس کی ساخت و پرداخت پر بہت کچھ لکھا جیسا کہ آپ نے انساب وشخصیات پر خوب طبع آزمائی کی اور صحافت کو تو گویا اپنا مشغلہ ہی بنالیا تھا اگر یہ کہا جائے صحافت پر پوری توجہ دینا ان کی مجبوری تھی تو غلط نہ ہوگا زیدان کا مختلف موضوعات پر لکھنا ایک تو ان کا کثرت مطالعہ ہے دوسرا مستشرقین ادباء ومورخین سے ہم آہنگی اور قربت تھی لیکن سب سے بڑی وجہ زیدان کا یورپ کا دورہ تھا وہاں کے کتب خانوں اور متاحف کا دورہ کرنا اور وہاں سے خوب اچھی طرح فائدہ اٹھانا تھا جس کی وجہ سے ان کے اندر مختلف زاویئے سے سوچنے کی ملکہ پیدا ہوگئی یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتابیں دور جدید کی کتابوں کے اصول وضوابط پر پوری طرح کھری اترتی ہیں بلکہ ان کے لئے خود اصول متعین کرتی ہیں۔

زیدن کی تصنیفات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مستشرق مصنف ان کی خدمت میں حاضر ہوا ملاقات کے بعد اپنا تاثر کا اظہار کچھ اس انداز میں بیان کیا ''زیدان میں تو تمہیں تمہاری تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کوئی بہت بوڑھا انسان ہے جس کے بال و لحیہ سب سفید ہو چکی ہے، اور آج تم سے ملاقات ہو رہی ہے تو دیکھ رہا ہوں کہ تم تو ابھی جوان ہو'' غرضیکہ زیدان کو دیکھ کر ان کی تحریروں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ زیدان کو بہت لمبی عمر نہ ملی تھی لیکن جو ملی اس کا پوری طرح استعمال کیا اور محض ۵۴ سال کی عمر میں وہ تمام کام انجام دے دیا جو کئی آدمی بھی مل کر نہ کر سکتے تھے اور وراثت میں سو سے زائد کتابیں چھوڑیں جو کہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود زیدان کے ساتھ وہ انصاف نہ ہوا جس کے وہ صحیح معنوں میں حقدار تھے۔ مصریوں نے ان کو خارجی سمجھ کر اپنے یہاں ادب میں جگہ نہ دی جبکہ شامیوں نے شاید اس لئے نظر انداز کر دیا کہ انھوں نے مصر کو اپنا مستقل مسکن بنالیا تھا وجہ کچھ بھی ہو لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ ان کے ساتھ وہ انصاف نہ ہوا جس کے وہ یقیناً حقدار تھے۔

☆☆☆

شاگردان نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ

ڈاکٹر تنویر حسن، لکچرر شعبۂ فارسی، گورنمنٹ ڈگری کالج، سرنکوٹ۔

مری زندگی کا حاصل کہ سبھی کو فیض پہنچے
میں چراغ رہ گذر ہوں مجھے شوق سے جلانا

خداوند تعالی کا بے پناہ شکر واحسان ہے کہ اس نے ہمیں ساری مخلوق میں سب سے افضل واشرف بنایا اور ہمیں اپنے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پیدا فرمایا۔ اللہ تعالی نے ہر عہد میں اپنے بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کو دنیا میں مبعوث فرمایا تا کہ وہ اس کے بندوں کو کفر، شرک، گمراہیت اور ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر خالق مخلوق کی بارگاہ اقدس میں سجدہ ریز کریں اور اس کی پاک ذات وصفات کی قدرت اور الوہیت ووحدانیت کا اعتراف واقرار کرتے ہوئے اس کے نبیوں اور رسولوں کی نبوت ورسالت کو بھی صدق دل سے تسلیم کریں۔ خداوند تعالی قادر مطلق ہے وہ چاہتا تو اپنے نبیوں اور رسولوں کو دنیا میں بھیجے بغیر بھی لوگوں کو راہ راست پر لاسکتا تھا کیونکہ وہ کسی بھی معاملہ میں کسی کا محتاج نہیں ہے بل کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اسی کا محتاج کرم ہے لیکن یہ اس کی مرضی ومشیت ہے کہ اس کے بندے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر کے حق کی راہ میں مشقتیں جھیلیں تا کہ وہ اپنے فضل اور عطاے خاص سے انہیں بلند درجات سے نوازے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس امر کی بجا آوری کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کو عہد بعہد مبعوث فرمایا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ انجام کار خداوند تعالی نے اپنے پیارے حبیب سرور کائنات تاجدار مدینہ احمد مجتبیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ورسالت کا دروازہ بند کر دیا۔ اب اگر اس کے بندے گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہوں گے تو ان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ عظیم منصب امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ دین اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اس کے تحفظ واستحکام کے لیے اس نے اپنے نیک بندوں علما، صلحا، صوفیہ اور اولیا اکرام کو منتخب فرما کر ان کے مقامات ودرجات کو بلند فرما دیا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے " العلماء ورثة" یعنی علما انبیا کے وارث ہیں کا مژدہ سنا کر علما کی قدر ومنزلت بڑھائی کہ جہاں ایک طرف علماے اکرام اسلامی مدارس میں اپنے درس وتدریس اور وعظ ونصیحت کے ذریعے اسلام کی تبلیغ اور نشر واشاعت کا کام انجام دیں گے وہیں دوسری طرف اولیا وصوفیا اکرام اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے ان کی طہارت نفس اور تزکیۂ باطن کا کام انجام دیں گے۔ یہی وہ دو جماعتیں ہیں جو انسانوں کا رشتہ فانی دنیا سے توڑ کر باقی رہنے والی ذات خداوندی سے جوڑتی ہیں۔ ان دونوں کا رتبہ اپنی اپنی جگہ بلند وبالا ہے۔ انہی میں سے ایک شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ بھی ہیں جنہوں نے اپنا سب کچھ نثار کر کے اس گروہ میں شامل ہونا اپنی سعادت سمجھا۔ شاگردان نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ پر روشنی ڈالنے سے قبل لازم ہے کہ ان کے مختصراً احوال کا ذکر کیا جائے۔

سرزمین ایران نے جو مشہور ترین دانش منداور شریعت وطریقت کے بزرگ پیدا کیے اُن میں احمد بن عمر بن محمد بن عبداللہ خیوقی خوارزمی ملقب نجم الدّین کبریٰ، ولی تراش وکنیت ابوالجناب بڑی امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کا شمار چھٹی وساتویں صدی ہجری کے مشائخ کبار میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش ۵۴۰ھ مطابق ۱۱۴۵ء میں بمقام خیوہ ہوئی۔ کنیت ''ابوالجناب'' سرور کائنات تاجدار مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں مرحمت فرمائی تھی۔ لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی میں ہی شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ بہت ذہین وفطین تھے۔ جب بھی ان کی کسی مسئلہ پر بحث ہوتی تو وہ اس پر غالب آجاتے۔ اسی بنا پر لوگ انہیں ''طامۃ الکبریٰ'' یعنی بڑی بلا کہتے تھے لیکن کثرت استعمال سے لفظ ''طامۃ'' متروک اور ''کبریٰ'' مشہور ہو گیا۔ شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ سلسلہ کبرویہ کے بانی تھے۔ ان کا نظام اصلاح وتربیت غیر معمولی پُر موثر تھا۔ یہ طریقہ کچھ ایسا حیات بخش تھا

کہ عالم وجد میں جس پر ان کی نظر مبارک پڑ جاتی گویا پتھر بھی ہوتا تو آئینہ بن جاتا۔ اسی وجہ سے ان کو ''ولی تراش'' کہا جاتا ہے۔ نجم الدّین قدس سرہٗ بہت سی کرامات کے مالک تھے۔ (نفحات الانس، ص ۴۱۹)

شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے والد ماجد ناصر الدّین عمر بن عبداللہؒ بھی بڑی امتیازی اہمیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند مرتبہ عارف، مستند عالم اور نامور صوفی تھے۔ شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔

۱۔ ابوالجناب نجم الدّین کبریٰ، ۲۔ شیخ عبداللہ، ۳۔ شیخ سعدؒ، ۴۔ شیخ حسینؒ، ۵۔ شیخ ابوالقاسمؒ، ۶۔ شیخ نصرؒ، ۷۔ شیخ قاسمؒ، ۸۔ شیخ عبدالرحمانؒ
۹۔ شیخ ابوالقاسمؒ، ۱۰۔ شیخ محمدؒ، ۱۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ (جواہر اولیا، ص ۱۶۳)

شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے ابتدا سلوک کی بات کی جائے تو جس وقت وہ تبریز میں شیخ محی الدّین السنہؒ سے شرح السنہ پڑھا کرتے تھے تو وہاں انہوں نے ایک درویش منش بزرگ کو دیکھا۔ جنہیں دیکھتے ہی ان کی حالت متغیر ہوگی اور وہ اضطرابی و مضطربی کی حالت میں مبتلا ہوگے۔ وہ درویش بابا فرج تبریزیؒ کی ذات مبارک تھی۔ دوسرے دن نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ نے اپنے استاد شیخ محی الدّینؒ سے بابا فرجؒ کے پاس جانے اور ان کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کی آرزو ظاہر کی۔ چنانچہ جب وہ بابا فرج تبریزیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ملاقات کی سعادت حاصل کی تو اس کے بعد شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ نے کتابیں پڑھنا موقوف کر دیا اور وہ ریاضت خلوت میں مشغول ہوگے بلکہ انہوں نے یکسوئی اور محنت کے ساتھ روحانی تربیت حاصل کرنے لگے۔ اسی دوران انہوں نے مختلف بزرگوں اور مشائخ طریقت سے ملاقات کی اور ان سے فیوض و برکات حاصل کیے۔ (نفحات الانس، ص ۴۲۰)

شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ ایام جوانی میں حدیث کی سماعت کے لیے خوارزم سے ہمدان تشریف لے گے اور وہاں اجازت حدیث حاصل کی اور سنا کہ اسکندریہ (مصر کے ایک مشہور شہر کا نام) میں ایک محدث بزرگ اسناد عالی کے حامل ہیں۔ وہیں سے اسکندریہ کا عزم کیا اور ان بزرگ محدث سے اجازت حاصل کرنے کے بعد واپسی پر ایک رات خواب میں پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف اور ''ابوالجناب'' کنیت سے سرفراز ہوئے۔ جب خواب سے بیدار ہوئے تو دنیا کی آلائشوں سے قطع تعلق کر لیا اور مرشد کی تلاش میں نکل پڑے۔

شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ اسی تلاش مرشد کے سفر میں ''خوزستان'' پہنچے۔ جہاں شیخ اسماعیل قصریؒ سے ملاقات ہوئی۔ یہاں وہ بیمار پڑ گے لیکن شیخ اسماعیلؒ کی توجہ سے جلد صحت یاب ہو کر انہی کے مرید بن گے۔ چند عرصہ کے بعد شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ نے خیال کیا کہ علوم ظاہری میں تو شیخ اسماعیلؒ سے فائق ہوں اور باطنی بھی کافی حاصل کر چکا ہوں۔ اس لیے اب مجھے یہاں سے عزم سفر کرنا چاہیے۔ اس بات سے شیخ اسماعیلؒ آگاہ ہوگے انہوں نے شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کو شام میں عمار یاسرؒ کی زیارت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ شیخ عمار یاسرؒ کی خدمت میں پہنچے اور کچھ دن ان کی خدمت میں رہ کر سلوک و عرفان میں مصروف رہے۔ پھر ایک دن وہی شیخ اسماعیلؒ والی بات ان کے دل میں آئی تو شیخ عمار یاسرؒ نے انہیں مصر میں شیخ روز بہان کبیر مصریؒ کی زیات کے لیے بھیجا۔ جب ان کی ملاقات روز بہانؒ سے ہوئی اس ملاقات نے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ روز بہان مصریؒ نے انہیں واپس عمار یاسرؒ کے پاس رخصت کیا۔ چنانچہ وہ شیخ عمار کی خدمت میں مدت تک مقیم رہے اور درجہ کمال پر فائز ہوگے۔ جب کبریٰ قدس سرہٗ نے سلوک و عرفان کی تمام منازل طے کر لیں تو وہ شیخ عمار یاسرؒ سے اجازت لے کر خوارزم آگے۔ (نفحات الانس، ص ۴۲۳)

خوارزم میں شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ نے اس صوفیہ کے طریقہ کو کافی رواج دیا اور بہت زیادہ مریدوں کی تعداد ان کے پاس جمع ہوگی۔

شیخ قدس سرہٗ رشد و ہدایت میں مشغول ہوگے۔ آپ اپنے اس مبارک کام میں مشغول تھے کہ کفار تاتاری خوارزم پہنچے۔ شیخ قدس سرہٗ نے اپنے بعض اصحاب کو طلب کیا اور اپنے اپنے شہروں کو جانے کا حکم دیا۔ پس اصحاب نے شیخ قدس سرہٗ کے ساتھ چلنے کی تمنا ظاہر کی لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب کفار شہر میں داخل ہوئے تو شیخ قدس سرہٗ نے بڑی بہادری اور جوان مردی کے ساتھ دشمنوں کا بھرپور مقابلہ کیا، انجام کار ۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۸ء جام شہادت نوش فرما گے! ''انا للہ انا الیہ راجعون''

شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کا مزار اقدس جرجانیہ (ازبکستان) میں مرجع خلایق ہے۔ صاحب تذکرہ ''گلستان مسرت'' نے شیخ نجم الدّین

کبریٰ قدس سرہٗ کی تاریخ وفات ذیل اشعار میں کہی ہے:

آنکہ خورشید پیش او صغریٰ بود — الملقب بہ نجم الدّین کبریٰ
نہم ماہ ز صوم و شنبہ بود — کہ ز دنیا بخلد عزم نمود
سال تاریخ نقل آن محمود — جز دم مقتدایی دین فرمود

(گلستان مسرت، ص ۳۷۵)

مولانا جلال الدّین بلخی نے اپنے اشعار میں اس واقع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا انتساب شیخ نجم الدّین قدس سرہٗ کے ساتھ کیا ہے۔ چند اشعار بطور مثال ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

ما از آن محتشمانیم کہ ساغر گیرند — نہ از آن مفلسکان کان بز لاغر گیرند
بہ یکی دست می خالص ایمان نوشند — بہ یکی دست دگر پرچم کافر گیرند

(ریاض العارفین، ص ۲۴)

شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ علوم وفنون کے سمندر اور سلوک وطریقت کے مخزن تھے۔ وہ کثیر التصانیف شیخ طریقت اور کثیر الجہت بزرگ تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے مشکل موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی علمی شخصیت وعظمت کا اندازہ ان کی ذیل تصانیف وتالیفات سے بھی ہوتا ہے:

۱۔ فواتح الجمال وفواتح الجلال، ۲۔ السائر الحائر، ۳۔ اقرب الطرق، ۴۔ الاصول العشرہ، ۵۔ رسالہ الخائف الھائم عن مومۃ احلائم، ۶۔ عین الحیوۃ فی تفسیر القرآن، ۷۔ رسالہ آداب الصوفیہ، ۸۔ رسالہ درسلوک، ۹۔ رسالہ سفینہ، ۱۰۔ آداب السالکین، ۱۱۔ رسالہ خلوت، ۱۲۔ آداب السلوک، ۱۳۔ ہدایت الطالبین، ۱۴۔ منہاج السالکین، ۱۵۔ منازل السائرین، ۱۶۔ طوالع التنویر، ۱۷۔ رسالہ درطریقۂ شطاریہ، ۱۸۔ شرائط خرقہ پوشیدن، ۱۹۔ سکینۃ الصالحین، ۲۰۔ صفت الادب، ۲۱۔ سرالحدس، ۲۲۔ رسالہ عرفانی، ۲۳۔ رسالہ درنصیحت وتبصرہ، ۲۴۔ رسالہ وصول الی اللہ، ۲۵۔ رسالہ مقابلہ عالم اکبر واصغر، ۲۶۔ رسالہ کبرویہ، ۲۷۔ رسالہ کلمات کبریٰ، ۲۸۔ رسالہ پیری ومریدی، ۲۹۔ رسالہ آداب

شاگردان کبریٰ قدس سرہٗ:

شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا اور ان کی مریدی میں شامل رہے۔ ان میں سے بعض ایسے شاگردوں کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جن سے آگے چلنے والے سلسلے کم وبیش آج بھی متداول ہیں:

شیخ مجد الدّین بغدادیؒ:

ابوسعید شرف بن مؤید ملقب مجد الدّینؒ کا خاندان مدت تک بغداد میں مقیم رہا لیکن مجد الدّینؒ کا تعلق خوارزم کے علاقے بغداد ک سے ہے۔ اگرچہ لوگ ان کو بغدادی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بغداد ک سے تھے اور وہ بغداد ک کی مناسبت سے مشہور نہیں ہوئے۔ ان کا شمار شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے مریدوں میں ہوتا ہے۔ ذیل عبارت سے یہ بات پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے:

"مجد الدّین قدس سرہٗ از شاگردان بلا فضل نجم الدّین کبریٰ و یکی از عرفانی نامدار و دارای فضل و کمالات بسیار بودہ است۔"

(نفحات الانس، ص ۶۲۴)

علی اکبر دھخدا کے مطابق ان کی تصانیف میں رسالہ سفر، رسالہ تحفۃ البررہ اور چند خطوط ہیں۔ مجد الدّینؒ شعر بھی کہتے تھے۔ صاحب تذکرہ "لباب الالباب" محمد عوفی اور مولانا جامیؒ نے نفحات الانس میں بھی ان کے اشعار شامل کیے ہیں۔ تاریخ گزیدہ میں سے آپ کے دو اشعار ذیل میں بطور

مثال نقل کیے جاتے ہیں:

یك مویی ترا هزار صاحب هوس است — تا خود بتو زین جمله کرا دسترس است
آن کس که بیافت دولتی یافت عظیم — و آن کس که نیافت درد نا یافت بس است

نجم الدّین رازیؒ:

نجم الدّین ابوبکر عبداللہ رازیؒ جو نجم دایہؒ کے نام سے مشہور ہوئے اور مشہور صوفی شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ان کی عمر کا ایک حصہ قونیہ میں گزرا اور مولانا جلال الدّین بلخی سے بھی ان کے روبط رہے۔ان کی وفات سعید نفیسی مرحوم نے ۶۵۴ھ مطابق ۱۲۵۶ء لکھی ہے۔تصوف کے موضوع پر ''مرصاد العباد'' ان کی معروف کتاب ہے جو ۶۲۰ھ میں مکمل ہوئی۔اس کے علاوہ انہوں نے فارسی میں رسالہ عقل وعشق، رسالہ الطیور، سراج القلوب اور مرموزات اسدی بھی لکھا ہے۔ان کی نثر بہت فصیح اور رواں ہے۔

شہاب الدّین سہروردیؒ:

ابوحفص محمد نام اور لقب شہاب الدّینؒ علاقہ زنجان کے قصبہ سہرورد کے مقیم تھے۔وہ اپنے زمانے کے بزرگ ترین صوفیا میں گنے جاتے ہے۔ وہ سلسلہ سہروردیہ کے بنیان گذار ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں بسر کیا۔اگرچہ انہوں نے اپنے چاچا شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردیؒ سے تربیت حاصل کی لیکن ان کا شمار شیخ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے مشفق مریدوں میں ہوتا ہے۔ذیل عبارت بطور مثال پیش کی جاتی ہے:

''او را نیز می توان از شیفتگان و مریدان شیخ نجم الدّین کبریٰ به حساب آورد، زیرا نسبت خرقه او به نجم الدّین می رسد۔'' (نجم الدّین کبریٰ، ص۲۳۲)

تصوف وسلوک پر ان کی ایک جامع کتاب ''عواف المعارف'' کے نام سے موسوم ہے۔

سیف الدّین باخرزیؒ:

ابوالحسن علی بن حسن باخرزیؒ کا شمار ساتویں صدی ہجری کے معروف مشائخ وصوفیا میں ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ شعروشاعری میں بھی ذوق رکھتے تھے۔ باخرزیؒ نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے مرید خاص تھے۔ذیل عبارت اس امر کی عکاس نظر آتی ہے:

''از مریدان نجم الدّین کبریٰ است که پس از اخذ خرقه از دست با کفایت شیخ۔''

باخرزیؒ نے بخارا میں رحلت فرمائی اور وہیں مدفن ہوئے۔ان کی مشہور کتاب ''دمیۃ القصر'' ہے اوران کی ایک رباعی ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

سیفا ز جفای دهر بسپار منال — هر گز مکن از زمانه اظهار ملال
کاین دولت دیگران و این محنت تو — چون نیك نظر کنی ملال است ملال

(تاریخ ادبیات درایران، جلد دوم، ص۸۵۶)

بابا کمال جندیؒ:

کمال الدّین مسعودؒ ماوراالنہر کے ایک علاقے جند کے رہنے والے تھے۔ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ تبریز میں گزرا۔سلطان حسین جلائر کے مقرب تھے۔ان کے عارفانہ مقام کے پیش نظر سلطان نے ان کی خاطر ایک خانقاہ بنوائی اور ایک وظیفے کے ساتھ انہیں اس خانقاہ میں فروکش ہونے کی اجازت دی۔کمال الدّینؒ وہیں پیوست خاک ہوئے۔ان کا شمار نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے عزیز مریدوں میں ہوتا ہے۔مولانا جامیؒ ذیل عبارت میں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''بابا کمال از تربیت یافتگان شوریده حال طریقه نجم الدّین است که به وسیله او خرقه

خلافت به تن کرد و در ترکستان به ارشاد مشغول گشت۔"

(نفحات الانس، ص۴۲۳)

تبلیغ اور نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ عارفانہ غزل کے شاعر بھی تھے۔ان کی ایک غزل کے بعض اشعار بطور مثال ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

زاهدان کمتر شناسد آنچه ما را در سر است — فکر زاهد دیگر و سودای عاشق دیگر است
زاهد دعوت مکن ما را به فردوس برین — کاستان همت صاحبدلان ز آن بر تر است

(فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۸۳)

بہاءالدّین ولدؒ:

مولانا جلال الدّین بلخی کے والد محمد بن حسین خطیبی جو بہاءالدین ولدؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کے اباواجداد عربی النسل تھے جو عرب سے آ کر بلخ آباد ہوئے تھے۔ان کا خاندان علم وفضل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ان کے خاندان میں بڑے بڑے محدث اور فقیہ پیدا ہوئے۔بہاءالدّینؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔وہ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ان کے علم وفضل کی وجہ سے خوارزم کے حکمران سلطان علاؤالدین محمد کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔اہل بلخ ان کے شیدائی تھے۔جب وہ وعظ کرتے تو خواص وعام ان کے وعظ میں شریک ہوتے تھے۔

بہاالدّین ولدؒ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں عقیدت مند آپ کے درس سے مستفید ہونے کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

"ایک دن خوارزم شاہ مولانا بہاالدّینؒ کے پاس گیا تو ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا، خوارزم شاہ نے حد سے زیادہ بھیڑ دیکھ کر امام رازیؒ سے کہا کہ "کس غضب کا مجمع ہے۔امام صاحب اس قسم کے موقع کے منتظر رہتے تھے، فرمایا ہاں اور اگر ابھی سے تدارک نہ ہوا تو پھر مشکل پڑے گی" خوارزم شاہ نے امام صاحب کے اشارہ سے شاہی خزانے اور قلعہ کی کنجیاں، بہاءالدینؒ کے پاس بھیج دیں اور کہلا بھیجا کہ اسباب سلطنت میں سے صرف یہ کنجیاں میرے پاس رہ گئی ہیں وہ بھی حاضر ہیں۔مولانا بہاءالدّینؒ نے فرمایا اچھا جمعہ کو وعظ کہہ کر یہاں سے چلا جاؤں گا، جمعہ کے دن شہر سے نکلے، خوارزم شاہ کو خبر ہوئی تو بہت پچھتایا اور حاضر ہو کر بہت منت سماجت کی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آئے۔" (سوانح مولانا رام، ص۶)

مولانا بہاءالدّینؒ نے ۶۱۰ھ میں جب مولانا جلال الدّینؒ کی عمر چھ سال کی تھی، بلخ کو خیر آباد کہا۔راستے میں ان کا گزر نیشاپور سے بھی ہوا۔ صاحب تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کے بیان کے مطابق ان کی ملاقات شیخ فریدالدّین عطارؒ سے ہوئی۔شیخ عطارؒ نے مولانا رومی کو سینہ سے لگایا اور مثنوی "اسرار نامہ" بطور تحفہ پیش کی۔بہاءالدّینؒ نیشاپور سے روانہ ہو کر بغداد پہنچے، یہاں مدتوں قیام رہا، روزانہ شہر کے امراور ؤسا ملاقات کو آتے تھے اور ان سے معارف وحقائق سنتے تھے۔شیخ بہاءالدّینؒ بغداد سے حجاز اور حجاز سے شام ہوتے ہوئے زنجان آئے۔زنجان سے لارندہ کا رخ کیا، یہاں سات برس قیام رہا۔اس وقت مولانا رومی کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، بہاءالدّینؒ نے اسی سن میں ان کی شادی کرادی۔لارندہ سے وہ کیقباد کی درخواست پر قونیہ آ گئے۔ انجام کار شیخ بہاءالدّینؒ نے جمعہ کے دن ۶۲۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (نفحات الانس، ص۴۰۹)

شیخ فریدالدّین عطارؒ:

تاریخ تصوف کی بارہویں صدی عیسوی کے صوفیائے اکرام میں شیخ فریدالدّین عطارؒ ایک اہم ترین ہستی ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری سے بے راہ روعقل کے اندھیروں میں عشق کا چراغ روشن کیا اور اپنی شاعرانہ توانائیوں اور کمال عشق الٰہی کے سوز سے دلوں کو گرما دیا۔انہوں نے والہانہ انداز میں اپنے صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا اور صوفیانہ شاعری کو وسعت بخشی۔شیخ عطارؒ کی صوفیانہ عظمت نے ان کے صوفیا اور علما کے لیے فیضان کا کام کیا۔یہی وجہ ہے کہ مولانا جلال الدّین بلخی بھی انہیں ذیل بیت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

هفت شهر عشق را عطار گشت ما هنوز اندر خم یك كوچه ایم

اصل نام محمد اور لقب فرید الدّین عطارؒ نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام ابوبکر ابراہیم اور پیشہ عطاری تھا۔ چنانچہ عطارؒ نے بھی یہی پیشی اختیار کیا اسی لیے عطارؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔عطارؒ نے ایام جوانی تحصیل علم میں گزاری اور اس کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت بھی کی۔اس سیر و سیاحت کے دوران ان کی زمانے کے معروف صوفیوں سے ملاقات بھی ہوئی۔شیخ عطار سلسلہ کبرویہ مجدالدّین بغدادیؒ کے مرید تھے۔ذیل عبارت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے:

"از دیگر معاصرین بلند آوازه نجم الدّین یکی نیز عطار نیشاپوری است ، از تربیت یافتگان مکتب نجم الدّین کبریٰ، بخصوص شاگردش مجدالدّین بغدادیؒ است۔ اگر چه برخی در انتساب او به نجم الدّین تردید دارند، اما طرفداران انتساب عطار نه نجم الدّین آنقدر زیاد قوی و استور است که جای هیچ گونه شك و شبهه ای باقی نمی گذرد۔" (نجم الدّین کبریٰ،ص۲۵۶)

اس کے علاوہ انہوں نے شیخ الشیوخ رکن الدّینؒ سے بھی کسب فیض کیا۔عطارؒ دار و فروشی کے ساتھ ساتھ طبابت بھی کرتے تھے لیکن اچانک ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر درویشوں کے حلقے میں شامل ہو گئے۔شیخ عطارؒ نے طویل عمر پائی انجام کار تاتاریوں کے ہاتھوں ۶۱۸ھ میں شہید ہوئے۔عطارؒ کا شمار فارسی کے عظیم صوفی شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی طبعیت میں روانی اور فکر میں جولانی تھی، چنانچی نظم و نثر میں متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ان میں مصیبت نامہ، الٰہی نامہ، خسرو نامہ، پندنامہ، اصرار نامہ، جواہر نامہ، شرح القلب، مظہر العجائب، لسان الغیب، مختار نامہ، دیوان، منطق الطیر اور تذکرۃ اولیا کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔تذکرۃ اولیا صوفیا، مشائخ اور اولیا اکرام کے اخلاق و کردار اور سوانح حیات پر مشتمل ہے۔مثنوی ''منطق الطیر'' ایک تمثیلی مثنوی ہے جو ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔مثنوی کے آغاز میں خداوند تعالی کی حمد و ثنا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صحابہ کی منقبت میں اشعار لکھے گئے ہیں۔ مذکورہ مثنوی مین ۴۵ مقالے اور ایک خاتمہ ہے۔اس مثنوی میں تیس پرندے تیس سالک ہیں اور سیمرغ ان کا محبوب ہے۔سالکوں نے جو صعبتیں برداشت کی ہیں، وہ حقیقیت میں عارفوں کی ریاضتیں اور مجاہدے ہیں۔سالکوں نے ذیل کی سات وادیاں عبور کی ہیں:

۱۔طلب و جستجو، ۲۔عشق، ۳۔معرفت، ۴۔استغنا، ۵۔توحید، ۶۔حیرت، ۷۔فنا

صوفیانہ مطالب بیان کرنے کے لیے عطار حکایتوں اور تمثیلوں سے کام لیتے ہیں اور بڑی سادہ زبان میں تصوف کے معارف بیان کرتے ہیں۔مولانا رومی ذیل شعر میں ان کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پی سنائی و عطار آمدیم

رضی الدّین لالاؒ:

شیخ رضی الدّین لالاؒ کا شمار بزرگان صاحب معرفت میں ہوتا ہے، معصوم علی شاہ ان کے بارے میں شاہ رقم زد ہیں:

"شیخ رضی الدّین از مریدان و دست پروردگان صاحب نام و مطرح نجم الدّین کبریٰ است، بیشتر اهمیت وی از این جهت است که سلسله کبرویه از ناحیه وه ادامه یافته و بر روزگار ما رسیده ، رشته بزرگ کبرویه از ایشان جاری گردید۔" (طرایق الحقایق،ص۳۳۹)

رضی الدّینؒ اگر چہ بہت سے مشائخ کی خدمت میں پہنچے لیکن نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ سے ان کی والہانہ عقدیت و محبت رہی ہے۔

سعد الدّین حمویؒ:

سعد الدّین حمویؒ کا شمار عظیم طالبان معرفت اور نجم الدّین کبریٰ قدس سرہٗ کے اصحاب میں ہوتا ہے۔وہ علم ظاہری و باطنی میں یگانہ روزگار تھے۔

انہوں نے اپنی عمر کے دس سال سیر وسیاحت میں گزارے۔قاسم غنی ان کی سیر وساحت میں راقم ہیں:

''در سفر های طولانی خویش در خوارزم به خدمت شیخ نجم الدّین رسیس و مجذوب وی گردید و در زمرۂ مریدان شیخ در آمد و با توجه به حسن شهرتی که درمیان اهل معرفت داشت، در ترویج طریقه کبرویه موثر افتاد۔'' (تاریخ تصوف دراسلام،ص۴۲۹)

ان کی تصانیف وتالیفات میں منجل الارواح، رسالہ قلب المنقلب وغیرہ شامل ہیں۔سعدالدّ ین حمویؒ زندگی کے آخری ایام میں اپنے آبائی وطن خراسان آ گئے تھےاور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ان کے علاوہ شیخ نجم الدّ ین کبریٰ قدس سرہٗ کے مریدوں میں شیخ جمال الدّ ین گیلیؒ، شیخ محمد خلوتیؒ، شیخ ضیا الدّ ین مسعود شیرازیؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اگر سلوک ومعرفت کی بات کی جائے تو تصوف صدیوں سے اہل علم کے درمیان موضوع بحث رہا ہے۔ادوار زمانہ کے ساتھ ساتھ بحث کی جہتیں بھی مختلف ہوتی گئیں۔صدیوں کے اس علمی اور نظریاتی سفر میں تصوف کو قدم قدم پر ایسے لوگ ملے جنھوں نے اپنا سب کچھ نثار کر کےاس قافلہ عشق ومستی میں شامل ہونا اپنی سعادت سمجھا۔

مآخذ ومنابع

۱۔ بدخشانی،مرزامقبول بیگ،ادب نامہ ایران،لاہور،سن ندارد

۲۔جامی،نورالدّ ین عبدالرحمٰن،نفحات الانس من حضرات القدس،تصحیح مہدی توحیدی پور،کتاب فروشی سعدی،۱۳۶۶ش

۳۔دھدا،علی اکبر،لغت نامہ دھخدا،تہران،۱۳۷۷ش

۴۔رازی،نجم الدّ ین،مرصادالعباد،باہتمام دکتر محمد امین،تہران،۱۳۶۵ش

۵۔شاکر،عبدالرحمٰن،گلستان مسرت،لاہور،۱۹۳۱م

۶۔صفا،ذبیح اللہ،تاریخ ادبیات درایران،جلد دوم،انتشارات امیر کبیر،۱۳۵۶ش

۷۔عبدالقاہر،شیخ ضیاالدین ابوالنجیب،آداب المریدین،مترجم عبدالباسط،لاہور،۱۹۹۸م

۸۔عوفی،سدیدالدّ ین محمد،لباب الاباب،تصحیح سعید نفیسی،تہران،۱۳۵۵ش

۹۔غنی،قاسم،تاریخ تصوف دراسلام،تہران،۱۳۵۶ش

۱۰۔کبریٰ،نجم الدّ ین،الاصول العشرہ،مترجم محمد غضنفر علی،لاہور،۲۰۰۳م

۱۱۔کبریٰ،نجم الدّ ین،رسالہ السائرالحائر،مترجم غلام حسن،نجیلو پاکستان،۲۰۱۵م

۱۲۔مستوفی،حمداللہ،تاریخ گزیدہ،باہتمام دکتر عبدالحسن،تہران،۱۳۶۴ش

۱۳۔محمدی،کاظم،نجم الدّ ین کبریٰ،سازمان چاپ وانتشارات وزارت فرہنگ وارشاداسلامی،۱۳۸۰ش

۱۴۔معصوم علی شاہ،حاج میرزا،طرایق الحقایق،جلد دوم،تہران،۱۳۳۹ش

۱۵۔معین،محمد،فرہنگ فارسی،انتشارات امیر کبیر،۱۳۶۲ش

۱۶۔محمد ریاض وصدیق شبلی،فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،دہلی،۲۰۰۴م

۱۷۔نعمانی،علامہ شبلی،سوانح مولانا رام،اعظم گڑھ،۲۰۱۰م

۱۸۔نعمانی،علامہ شبلی،شعرالعجم،جلد دوم،اعظم گڑھ،۲۰۱۱م

۱۹۔ہجویری،سیدعلی بن عثمان،کشف المحجوب،مترجم مفتی غلام معین الدّ ین نعیمی،دہلی،سن ندارد

۲۰۔ہدایت،رضاقلی،تذکرہ ریاض العارفین،تہران،۱۳۱۶ش

ناول ''جس دن سے.....!'' کا فنی اور خصوصی مطالعہ

توصیف بریلوی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

tauseefbareilvi@gmail.com

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جو خاتون ناول نگار اردو ادب کے افق پر نمودار ہوئیں ان میں صادقہ نواب سحر پیش پیش ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے بعد ایک افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ان کے نئے ناول ''جس دن سے.....!'' کی فنی خصوصیات پر بحث کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ ناول جس دن سے حال ہی میں یعنی رواں سال ۲۰۱۶ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ ناول کا عنوان پڑھتے ہی قاری متجسس ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ ''جس دن سے.....!'' اس فقرے کے بعد مصنفہ کیا کہنے والی ہیں؟ پورے ناول کا مطالعہ کرنے پر عنوان کی معنویت بخوبی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نے اس ناول میں ''جیتیش'' نامی ایک معمولی لڑکے کی کہانی پیش کی ہے۔ جیتیش عرف جیتو زندگی سے اس قدر اداس، ہارا ہوا اور مایوس ہو چکا ہے کہ اسے زندگی جینے کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ اسی سبب وہ چڑچڑا بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا شخص اسے نہیں ملتا جو اسے سکون دے سکے۔ اس کے ماں باپ ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنی اپنی دنیا میں کھو گئے لیکن یہ کسی نے نہیں سوچا کہ ایک چھوٹے بچے کو اس عمر میں ماں اور باپ دونوں کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت دونوں سے محروم ہو گیا۔ حالانکہ باپ کے ساتھ رہا بھی لیکن ان کی شراب نوشی اور سوتیلی ماں کی وجہ سے نباہ نہ ہو سکا۔ جب کالج سینٹر میں جاب کرنے لگا تو الگ ہو گیا اور اپنی زندگی کی ہچکولے کھاتی ہوئی بیا کو خود ہی کھینے لگا۔ اسے نہ تو کبھی سچا پیار ملا اور نہ ہی وہ پڑھائی میں کچھ بہتر کر سکا۔ بمشکل تمام ناول کے اخیر میں وہ وکالت کی پڑھائی کئی سال بعد مکمل کر پاتا ہے۔

ناول کو واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہے اور وہ واحد متکلم ناول کا مرکزی کردار جیتیش ہے۔ ضرورتاً مکالموں سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن پھر بھی پورا ناول پڑھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آپ بیتی سنا رہا ہو بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ناول ''جس دن سے.....!'' آپ بیتی کی طرز پر لکھا ہوا ناول ہے۔

ناول میں جو منظر نگاری کی گئی ہے وہ مؤثر اور اصل سے بے حد قریب لگتی ہے۔ چوں کہ مصنفہ خود مہاراشٹر کی رہنے والی ہیں اور ممبئی میں ہی ان کی تعلیم ہوئی ہے۔ انھوں نے ممبئی میں کئی علاقوں کو از خود بستے ہوئے دیکھا ہے۔ ناول کی فضا اور رہن سہن مہاراشٹر اور خاص طور پر ممبئی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ان کا مشاہدہ ناول میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں منظر نگاری کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''نئی ممبئی میں سی بی ڈی بیلا پور علاقے کا ماحول بہت اچھا ہے۔ یہاں بہت سکون ہے۔ پوری نئی ممبئی میں سب سے زیادہ ہریالی یہیں دکھائی دیتی ہے۔ پولیس اسٹیشن کے پیچھے اور بس اسٹینڈ سے لگا ہوا ایک بڑا آم کا باغیچہ ہے۔ نیرول، واشی، جوئی نگر، پنویل جیسے نئی ممبئی کے علاقوں میں جیسی سہولتیں ہیں ویسی یہاں بھی ہیں۔ یہاں سیکٹر چار اور چھ میں بڑے مارکیٹ ہیں۔ شام کو گھومنے کے لئے اچھی جگہیں ہیں۔ یہاں میرے بہت سے دوست بن گئے۔ ساحل کے ساتھ کی یادیں کچھ گہری ہیں۔ مجھے یہ پورا علاقہ اچھا لگتا ہے۔ سیکٹر آٹھ میں بند باندھے ہوئے ہیں۔ اس کے قریب 'آرٹسٹ ولیج' ہے۔ سڈکو کے پلاٹ پر بنے ہوئے، چھوٹے چھوٹے گھر کاٹج نما تھے۔ آج یہاں ان گھروں پر سان پاڑہ جیسی ہی ایک اور دو منزلہ عمارتیں بن گئی ہیں۔ سی بی ڈی میں سڈکو کی نرسری بڑی فطری لگتی ہے۔ شیڈیولڈ نیٹ یعنی جالی یا ہرے شیڈ میں پودے نہیں لگائے گئے ہیں۔ پہاڑ کی

ڈھلان پر فینسنگ میں وہ اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ ''[۱]

والدین کے ہوتے ہوئے بھی جیتو محرومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔اِس کے لئے اس کے والدیں ذمہ دار ہیں۔باپ کے مقابلے ماں زیادہ فکرمند ہوتی ہے۔باپ ایک گھڑی بچوں سے قطع تعلق کر بھی سکتا ہے دورِ حاضر کی Materialistic سوچ نے ماں کو بھی تبدیل کر دیا ہے اور وہ بھی اپنے بچے کے بغیر رہ سکتی ہے۔جیتو کا باپ اس کی ماں سے الگ ہو کر دو شادیاں کرتا ہے تو اس کی ماں بھی ایک آدمی کے ساتھ Live in relation میں رہنے لگتی ہے۔ناول کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نیا Indication تو نہیں ہے لیکن بروقت ہے۔ایسا نہیں ہے کہ پہلے ایسا نہیں ہوا ہوگا لیکن آج یہ ایک عام بات ہوگئی ہے۔اس موقعے پر اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' یاد آتی ہے۔اختر الایمان کے والدین ہوتے ہوئے بھی ان کی تعلیم یتیم خانے میں ہوئی۔ان کے والد صاحب کے بارے میں بھی یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ انھوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ٹھیک اسی طرح والدین کے ہوتے ہوئے بھی جیتو دونوں سے الگ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ایسے میں اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' ذہن میں گھومنے لگتی ہے۔یہ وہی لڑکا ہے جو اختر الایمان کی نظم سے بھاگ کر اس ناول میں آ گیا ہے۔

کسی بھی ناول کا پلاٹ بہت اہم ہوتا ہے۔اس میں قابل غور بات یہ ہوتی ہے کہ پلاٹنگ کس طرح کی گئی ہے۔یعنی واقعات اور مناظر کی ترتیب اور ان کے روابط کیسے ہیں۔واقعات کا ایک دوسرے سے ربط ایک عمدہ پلاٹنگ کی نشانی ہوتا ہے۔ناول نگار نے اس بات کا خیال رکھتے ہوئے ناول کو چھوٹے چھوٹے واقعات اور مناظر میں پیش کیا ہے۔جس کی وجہ سے ناول کا پلاٹ مربوط ہو گیا اور کسی قسم کا جھول نظر نہیں آتا۔پلاٹنگ کی اس ٹیکنک کو دیکھ کر ناول امراؤ جان ادا کے رسوا کی ٹیکنک ذہن میں گھومنے لگتی ہے۔رسوا ضروری باتیں امراؤ سے پوچھتے ہیں اور غیر ضروری باتیں ترک کر دیتے ہیں۔ناول میں جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں وہ بڑے دلچسپ ہیں اور کہانی کو سمجھنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب کو بچوں کی نفسیات سے بھی گہری واقفیت رکھتی ہیں۔انھوں نے جیتو کی بچپن کی زندگی کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ کافی حد تک فطری لگتی ہیں۔جیتو کے اسکول کے واقعات، والدین کا سلوک، لاڈ پیار، اسکولی دنوں کے چار معاشقے جنھیں بعنوان 'شاید چار لڑکیاں' کے تحت پیش کیا گیا ہے۔باپ کی شادی اور اس کی اولاد سے بھی جیتو متنفر رہتا ہے اور ایک دن اپنے باپ سے دوٹوک کہہ بھی دیتا ہے۔اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''شاید اسکولی زندگی میں میری زندگی میں چار لڑکیاں آئیں، مِلی، زاہدہ، شلپی اور رانی.....''[۲]

''ڈیڈھ سال بعد ڈیڈ کو بیٹا ہوا۔میرے علم میں تو دو بار ابارشن کروایا۔پتہ نہیں اس بار مینا نے ڈیڈ کو کیسے منا لیا۔ڈیڈ
یہ زیادہ ہو گیا ہے، دو لڑکے ہیں نا!
جارے!.....تیرے جیسے ہزار پیدا کر سکتا ہوں!!!! پراپرٹی کی پڑی ہے کیا؟
مجھے نہیں چاہئے آپ کی پراپرٹی!
میں شادی نہیں کروں گا!.....میرے حصے کی شادی بھی ڈیڈ آپ نے کر لی!'' [۳]

مندرجہ بالا دونوں اقتباس جیتو کی زندگی کے دو الگ الگ پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں لیکن دونوں کا تعلق جیتو کی نفسیات سے ہے۔ایک طرف اس کے بچپن کے معاشقے دکھائے گئے ہیں۔حالانکہ اس کی زندگی کا کوئی معاشقہ پائدار ثابت نہیں ہوا۔پھر بھی بچپن سے ہی کسی کے پیار اور سہارے کو تلاشتا رہا۔ان چار وں لڑکیوں کے نام پر الگ الگ عنوانات قائم کر کے جیتو کے معاشقوں کی وضاحت کی گئی ہے۔اسی طرح جیتو کا اپنے والد سے یہ کہنا کہ ''میں شادی نہیں کروں گا!.....میرے حصے کی شادی بھی ڈیڈ آپ نے کر لی!'' یہ جملہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔اس کے باپ نے تین شادیاں کیں، پہلی جیتو کی اپنی ماں تھی باقی مینکا اور مینا کو جیتو نے کبھی ماں نہیں سمجھا۔وہ اپنے باپ سے یہ بھی کہتا ہے کہ اس شادی کی کیا ضرورت تھی اور یہاں تک کہ اپنے سوتیلے بھائی کی پیدائش پر بھی ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔جیتو جن حالات سے گزر رہا تھا ایسے میں اس کا اپنے باپ سے اس طرح بولنا کوئی

تعجب کی بات نہیں بالکل فطری لگتا ہے۔

ماں باپ کے الگ ہونے کے بعد جیتو نے بے حد مشکل زندگی گزاری۔ان کے ساتھ میں رہتے وقت حالات اتنے برے نہیں تھے۔پھر بھی بچپن سے وہ محرومیوں کا شکار رہتا ہے۔ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''نویں تک یعنی پونا جانے تک یہ احساس دل میں چبھتا رہا کہ دوسروں کے پاس سب کچھ ہے، میرے پاس نہیں! میرے پاس کھلونے کم تھے، سائیکل، فٹ بال اور کرکٹ کے سامان تو تھے لیکن مہنگے کھلونے مانگتا تو ڈیڈی منع کر دیتے تھے۔ہاٹ وہیلس کی گاڑیاں، ریموٹ کنٹرول کاریں، دوربین، نئے کپڑے مانگنے پر نہیں ملتے تھے۔مجھے لگتا کہ اس نے لیا تو مجھے بھی ابھی لینا چاہئے''۔کالج جانے کے بعد میری سوچ بدل گئی!.....کسی سے گھلنا ملنا نہیں، بات نہیں کرنا، پورا کا پورا بدل گیا! اس بات پر میں نے پچھلے دنوں غور کیا!'' ۴

موجودہ دور میں نئی نسل میں جو بے راہ روی یا غیر سنجیدگی دیکھی جارہی ہے اس کا اثر بھی جیتو پر گہرا دکھائی دیتا ہے۔ناول کا باریکی سے مطالعہ کرنے پر یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ناول نگار نے جیتو کی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنی آنکھوں سے گزارا ہے۔انھوں نے اس کے بچپن سے جوانی تک کے بیشتر قصے سلیقے سے بیان کئے ہیں۔جیتو جب ایبڈو نامی کال سینٹر میں جاب کرنے لگتا ہے اور وہاں کے ماحول سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔کال سینٹر کی راتوں کی شفٹ کس طرح گزرتی ہے۔وہاں کام کرنے والے لڑکے لڑکیاں آپس میں کس حد تک قریب آجاتے ہیں اور یہ قربتیں وقتی ہوتی ہیں ان میں پائداری یا سنجیدگی نام کی چیز نہیں ہوتی ہے۔عام طور پر کال سینٹر کا جو ماحول بن چکا ہے اس کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔اس سے متعلق ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''سنیچر کو ABDO سے صبح تین بجے سے چھوٹ کر ہم پونہ جاتے ہیں۔.....وہی پکنک وغیرہ.....۔ماحول بنا رہتا تھا۔ٹائم پاس کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ہو۔لڑکیوں کو پٹانا، گھمانا، پھر ایک دن چھوڑ دینا۔بس وقت گزاری کے لئے۔لڑکیاں بھی ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔بس دکھانے کو جذباتی ہیں.....'ساتھ میں' رہے تو ''تو میرا''، الگ ہوئے تو، تو کون، میں کون؟'' ۵

ناول ''جس دن سے.....!''ممبئی اور اس کے اطراف کے پس منظر مین لکھا گیا ہے۔مہاراشٹر کے رسم و رواج، کھان پان، رہن سہن، لباس، ثقافت اور ہندو میتھالوجی کو بھی ناول میں خاص طور پر پیش کیا گیا ہے۔کہیں کہیں کچھ جملے بھی مراٹھی میں لکھے گئے ہیں۔تیوہاروں پر بننے والے مہاراشٹر کے پکوانوں کا ذکر بھی بہت خوب ہے۔کچھ نام تو ایسے ہیں جن کو ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن کچھ نہیں۔اس طرح کے عناصر شامل کرنے سے ناول میں ایک قسم کا Local Touch پیدا ہوتا ہے اور قاری تھوڑی دیر کے لئے جیتو کی پریشانیوں کو بھول کر مہاراشٹر کے تیوہاروں، رسم و رواج اور پکوانوں سے محظوظ ہونے لگتا ہے۔صفحہ ۱۹۵ سے ۱۹۹ تک مطالعہ کرنے سے مندرجہ بالا بات کی وضاحت ہو جائیگی۔ہم یہاں طوالت کی وجہ سے صرف ایک اقتباس درج کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''تیوہاروں کے دن خاص طور پر ہولی کے دن پورن پولی، تیکھی آمٹی یا پورن پولی کے لئے ابلی چنے کی دال کے بچے پانی سے بنی سبزی، نارلی پوری، مودک اور دودھ میں گڑ ملا کر گُڑوَنی بناتیں.....جس میں الائچی مسالہ ڈالتیں۔الگ سا میٹھا مزہ ہوتا۔بھجیا پاپڑ، گُرڈئی جیسی تلی ہوئی چیزیں کھاتے۔'' ۶

زندگی کی تلخیوں سے دو چار ہونے اور ماں باپ سے الگ رہنے کی وجہ سے جیتو ناستک ہوتا چلا گیا۔کسی بھگوان میں اسے یقین نہیں رہ گیا۔وہ لامذہب بن گیا لیکن کبھی کبھی اپنے بچپن کے دن یاد کرتا جب اس کی ماں اسے بٹھا کر اس کے تلک لگاتی اور پورے ریتی رواج کے ساتھ پوجا پاٹھ کرتی۔جیتو اور اس کا بھائی بھی اپنی ماں کے ساتھ پوجا کرتے۔جیتو جب پوری طرح خود کفیل اور اپنی مرضی کا مالک ہو گیا تب وہ کسی طرح کی پوجا پاٹھ

سے کترانے لگا بلکہ صاف منع کرنے لگا۔اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سکھ دیو جی رشی؟ نے پران کی کہانی بڑا سکھ ساگر سنائی اور پرکشِت کو شراپ سے مکتی ملی۔اسی لیے اسے سب سے اچھا اور پوتر مانتے ہیں۔تو بھی پڑھنا۔
تم پڑھتی ہو نا۔کافی ہے۔
مجھے دیکھتے ہی نصیحتیں یاد آتی ہیں! جانے کہاں کہاں سے گیان اپدیش ڈھونڈ لاتی ہو۔وہ میری بات کو نظرانداز کرتی ہیں اور کہتی ہیں، کہتے ہیں سات دنوں میں پورا پڑھ لیا تو مکتی ملتی ہے۔ہاں۔کہہ چکی ہو، مگر مکتی کس کو چاہیے؟'' ۷

جیتو کے بچپن سے لیکر جوانی تک کئی افیئر ہوئے لیکن کوئی معاشقہ کامیاب نہ ہو سکا۔اسکولی دنوں میں ہی اس کی چار لڑکیوں سے دوستی ہوئی تھی اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔کال سینٹر کی جاب کے دوران بھی اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی رہی۔ساتھ گھومنا پھرنا، کھانا پینا بھی ہوا۔جیتو کی زندگی میں سترہ سال کی کمسن لڑکی سے لے کر تین سال بڑی لڑکی بھی آئی لیکن نباہ کسی سے نہ ہو سکا۔ایک لڑکی ششما جو سانولی تھی۔جیتو اسے بلیک بیوٹی کہتا تھا وہ بھی جیتو کو اس کی نااہلی کی وجہ سے چھوڑ دیتی ہے۔یہاں پر دورِ حاضر میں صنفِ نازک کے مطلب پرست اور Demanding ہونے کو صاف طور پر بتایا گیا ہے۔اس سے متعلق اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''تم پڑھائی میں سنجیدہ نہیں۔ایسے کیسے؟، میں تم سے شادی نہیں کر سکتی!وہ بہت زیادہ اپ سیٹ تھی۔میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔دیکھو، میرا ہسبینڈ اچھا پڑھا لکھا ہونا چاہئے۔اچھا کمانے والا۔مانگوں وہ چیز دے۔تم مجھے نہیں دے سکتے تو شادی نہیں کر سکتی۔میری پلکیں جھک گئیں۔'' ۸

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آج لڑکیوں کی ذہنیت کیا بن چکی ہے۔اب وہ دورِ قدیم کی ستائی ہوئی عورت نہیں رہیں ہیں۔انھیں تو ہر چیز مین پرفیکشن کی لت ہوگئی ہے۔اپنے حال کو سمجھنے سے پہلے ہی وہ مستقبل کو Secure کرنے کے بارے میں سوچنے لگتی ہیں۔بعض اوقات ایسا سوچنا صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن اس وجہ سے رشتوں کی اہمیت اور ان کا استقلال متزلزل ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ظاہری بات ہے کہ جس طرح لڑکے مطلب پرست ہوا کرتے تھے یا ہیں، آج اس میدان میں لڑکیاں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔وہ صرف More better more better والے فارمولے پر زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی ہیں۔مصنفہ نے ایک طرف جیتو جیسے نوجوان کی کشمکش اور کسمپرسی کو پیش کیا ہے تو دوسری طرف عورتوں اور لڑکیوں کی عیاریوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔وہ دور گزر چکا ہے جب عورت ''بیچاری'' ہوا کرتی تھی بلکہ اب وہ دنیا کے ہر شعبہ میں مردوں سے آگے نظر آتی ہے۔ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ کے پہلے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' پر تانیثیت کا الزام لگا تھا لیکن اس نئے ناول کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایسا نہیں تھا، کیونکہ مصنفہ نے ناول ''جس دن سے......!'' میں جیتو نامی لڑکے کے ساتھ ہوئی ناانصافیوں کو پوری ایمانداری سے فوکس کیا ہے۔ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے بعد میں کچھ اور۔اس جملے کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی فن پارے کو ادب کے زمروں میں بانٹنے یا اس کو categorise کرنے سے پہلے اس کی ادبیت پر غور و فکر کرنا چاہئے۔

آج ماڈرن زمانہ ہے۔رشتوں میں بھی پاسداری اور گنجائش باقی نہیں رہی جو کسی رشتے کے لئے اشد ضروری ہوتی ہے۔اپنے کنبے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی آج ہم اجنبیوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔اپنا اچھا اور برا WhatsApp اور Facebook جیسی سائٹس پر تو شیئر کر سکتے ہیں لیکن اپنے گھر والوں سے نہیں۔ناول میں جیتو کے ماں باپ کے الگ ہونے کا زمانہ بہت زیادہ پرانا نہیں ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشتوں میں جب کڑواہٹیں سرائیت کرنے لگتی ہیں تو کوئی بھی اپنے صبر کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ لوگوں کی سوچ یہ ہوگئی ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں ہیں تو الگ ہونے میں ہی بھلائی ہے۔اب ایسے میں بچوں پر کیا گزرے گی؟ وہ کہاں جائیں گے؟ کس کے ساتھ رہیں گے؟ ان کی تعلیم و تربیت کا ذمہ کون

لیگا؟ ممتا اور شفقت جیسی دولت کہاں سے حاصل کریں گے؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنی انا اور ضد کو پورا کرنے میں کنبہ برباد ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے روزانہ نہ جانے کتنے جیتو پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ممبئی یا دیگر بڑے شہروں میں اس طرح کی واردا تیں زیادہ ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہندوستان ٹائمز کے ایک اشیو میں کئی شہروں کے Divorce Cases دئے گئے تھے۔ ہم یہاں مزید شہروں کی رپورٹس سے اجتناب کرتے ہوئے صرف ممبئی شہر کی ایک رپورٹ پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

" A RISING GRAPH

11,667 Cases of divorce were filed in mumbai in 2014(till november 30),up from 5245 cases in 2010."[۹]

ایک تازہ خبر کے مطابق کیرلا میں ہر گھنٹے کم از کم پانچ جوڑے طلاق لیتے ہیں۔ رپورٹ ملاحظہ فرمائیں:

"Statistics of separation:At last 5 couples get divorced in kerla every hour."

(Thursday 23 june 2016 05:09 pm IST)[۱۰]

ان رپورٹس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صورت حال کیا ہے؟ مصنفہ نے ناول کے موضوع کے انتخاب میں جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا اس سے ان کی عصری حسیت اور سماج کے تئیں بیداری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ انھوں نے جس حسن خوبی سے موضوع کا انتخاب کیا ہے ویسے ہی اسے نبھانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ناول ''جس دین سے.....!'' اپنے اندر عبرت کا پیام لئے ہوئے ہے لیکن مصنفہ کا مقصد ناول پر کہیں بھی حاوی ہوتا نظر نہیں آتا۔ ناول کا بغور مطالعہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ اس میں صرف جیتو کی ہی کہانی نہیں بلکہ کئی اور مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ ناول کثیر الجہات ناول بن جاتا ہے۔ اس مضمون میں ناول کی Theme سے ہٹ کر بھی دیگر جہتوں پر بحث کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا دونوں رپورٹس سے ہم صرف ہندوستان کے دو خطوں کے حالات سے واقف ہوتے ہیں جبکہ World wide جائزہ لینے پر جو Top-Ten ممالک کی فہرست سامنے آتی ہے اس میں ہندوستان شامل ہی نہیں ہے۔ تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ دور حاضر کا یہ مسئلہ ایک عالمی مسئلہ بن گیا ہے اور دن بہ دن ایک وِکرال روپ لیتا جا رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہا جا سکتا ہے ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ نے بہت ہی اہم موضوع پر اپنی Genuine فکر کو ناول کا جامہ پہنا کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے اور جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔

حواشی:-

(۱) ''جس دن سے.....!''، صادقہ نواب سحرؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص-۲۲، ۲۳ (۲) ایضاً، ص-۳۰

(۳) ایضاً، ص-۹۶ (۴) ایضاً، ص-۳۷ (۵) ایضاً، ص-۱۸۳

(۶) ایضاً، ص-۱۹۵ (۷) ایضاً، ص-۲۸۲ (۸) ایضاً، ص-۳۲۸

(۹) www.hindustantimes.com/sex-and-relationship/how-and-why-number-of-young-indian-couples-gettings-divorced-has-risen-sharply/story-mEuaEoviw40d6ilzbGu6j.html

(۱۰) english.manoramaonline.com/news/kerala/average-5-divorce-cases-every-hour-kerala-family-counts.html

☆☆☆

علامہ عبدالواحد بلگرامی اور''سبع سنابل''

ڈاکٹرمحمدضیاءالدین،گیسٹ لکچرر شعبہ عربی وفارسی،الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

ہندوستان میں پورب[۱] کی زمین کو جوعلمی مرتبہ حاصل رہا ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔ یہاں کے جو شہر تھے وہ تو علمی درسگاہیں تھے ہی لیکن یہاں کے جو قصبات کاکوری،سندیلہ،موہان خیراباد،مبارک پور،بلگرام وغیرہ بھی علم وفضل اور درس وتدریس کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔قصبہ بلگرام علم وفضل،شعروادب،معرفت وسلوک کے اعتبار سے بہت زرخیز علاقہ رہا ہے۔یہاں سے علوم وفنون کے ایسے درخشاں ستارے نمودار ہوئے جو علمی دنیا کے آسمان پر یکتا نظر آتے ہیں اور انہی کی وجہ سے بلگرام فضلاء،علماء،مشائخ،اولیاءاللہ،مرشدین ومسترشدین کا مرکز ومسکن بنا رہا۔ان کے علمی،درسی،تدریسی،تصنیفی،تالیفی کارناموں سے دور دراز علاقوں کے طلباء اپنی پیاس بجھانے کے لئے جمع ہونے لگے۔اہل بلگرام بھی ان کی تواضع،اکرام اور خاطر مدارات کو اپنے لئے سعادت دارین سمجھتے اور ان کی مہمان نوازی میں کوتاہی نہ کرتے۔علامہ بلگرامی مآثر الکرام میں رقمطراز ہیں:

''و صاحب تو فیقان هر معموره طلبه علم رانگاه می دارند و خدمت ایں جماعة را سعادت عظمی می دانند'' (۲)

[۱](سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ملا محمود جونپوری کے حالات میں لفظ''پورب'' کی جو تشریح کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ تین صوبوں اودھ،الہ آباد اور عظیم آباد پر مشتمل تھا اس کے قصبات اپنے گونا گوں حیثیتوں میں شہر کے مدمقابل تھے،آج بھی پورب کے قصبات تہذیبی،ثقافتی اور علمی لحاظ سے اہم ہیں)(۱)

مؤرخین،مؤلفین،شعرا اور ادباء نے بلگرام کی توصیف میں اشعار کہے۔علامہ عبدالجلیل بلگرامی بلگرام کی مدح میں رقمطراز ہیں:

سبحان اللہ چہ بلگرامے کو ثر مئے آفتاب جامے
خاکش گل نو بہار عشق است آبش مئے بے خمار عشق است
از عشق سرشت ایزد پاک از روز ازل ایں خمیر ایں خاک
ہر گل کہ دمیدہ است زایں خاک خونی جگریست پیرہن چاک (۳)

علامہ عبدالجلیل بلگرامی ہی نے فضلاء وفقراء بلگرام کی مدح میں مندرجہ ذیل اشعار کہے:

از فرقہ طالبان مو لی رنگینئ بزم وصف اولی
وحدت نگہاں کثرت آثار ازبادۂ نفی غیر سرشار
اطوار وجود دیدہ یکرنگ حیرت بنگاہ کردہ ہم سنگ
بینان شکنان بزم ہستی مدہوشِ شراب حق پرستی
دل کردہ ز بہر یار خورد فرش الرحمٰن استوی علی الفرش (۴)

علامہ عبدالواحد بلگرامی علم وفضل کے وہ سرچشمہ تھے جس سے گلشنِ شعروادب میں بہار آ گئی اور معارف وسلوک کے وہ روشن ستارہ تھے جس کی روشنی سے ایک عالم منور اور مجلی ہو گیا۔حضرت بلگرامی ۹۱۲ھ میں دارالعمل میں جلوہ افروز ہوئے،اپنے ہی علاقہ کے علماء کاملین،فضلاء صالحین سے اکتساب علم کیا جنھوں نے ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی،حضرت بلگرامی ہمیشہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز ومیّز رہے۔

عربی ادب کے مشہور تذکرہ نگار نزہۃ الخواطر کے مصنف مولانا سید عبدالحئی تحریر کرتے ہیں:

''احد العلماء المبرزين فى المعارف الالٰهية ، كان صاحبَ الفضائل العلمية والكرامات الجليلة والأذواق

الصحیحة والمواجه الصادقة''(۵)

معروف مؤرخ صاحب منتخب التواریخ ملاعبدالقادر بدایونی جوحضرت بلگرامی سے ذاتی طور پر واقف تھے اور حضرت سے ان کی ملاقات بھی تھی اور اس ملاقات کا ذکر علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے فارسی تذکرہ ''مآثر الکرام'' میں کیا ہے، علامہ کا خیال ہے کہ ملا بدایونی کی یہ ملاقات ۹۷۹ھ میں ہوئی ہے جیسا کہ خود صاحب منتخب التواریخ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ بہر حال علامہ بدایونی حضرت بلگرامی کے بارے میں اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

''شیخ عبدالواحد بلگرامی بسیار صاحب فضائل وکمالات وریاضت وعبادات است واخلاق سَنیۃ وصفات رضیہ دارد ومشرب او عالی است''(۶)

بلگرام کے نامور محدث، مؤرخ اور ادیب علامہ غلام علی آزاد رقمطراز ہیں:

''قطب فلک ولایت ومرکز دائرہ ہدایت بود صاحب آیات ظاہرہ وکرامات باہرہ بود''(۷)

حضرت بلگرامی نے سلوک ومعرفت کی منزلیں اس دور کے شیخ طریقت شیخ صفی الدین بن عبدالصمد سائیپوری جو شیخ سعدالدین خیرآبادی کے خلیفہ تھے(۸) کی شاگردی میں طے کیں، مرشدِ باصفا نے حضرت بلگرامی پر خاص توجہ فرمائی لیکن یہ سلسلہ بہت دیر تک نہ چل سکا کیونکہ مرشد شیخ صفی الدین کا ۹۳۳ھ میں انتقال ہوگیا، اس وقت حضرت بلگرامی کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ شیخ صفی الدین کے خلیفہ اجل شیخ حسین (متوفی ۹۷۶) نے حضرت بلگرامی کو اپنے آغوش تربیت میں لے لیا اور خلعہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت بلگرامی کے مزاج میں تواضع وانکساری حد درجہ تھی چنانچہ خرقہ خلافت کے حصول کے بعد بہت دنوں تک سلسلہ بیعت شروع نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ کے مرشد نے اس کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ حضرت بلگرامی اتباع شریعت کا بہت خیال رکھتے تھے، پوری زندگی رشد وہدایت، تعلیم وتذکیر، اصلاح وتربیت اور تصنیف وتالیف میں گذار دی۔ دنیاوی سرگرمیوں اور اس کے ہنگاموں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ایک مرتبہ بادشاہ وقت سے ملاقات کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی ''مآثر الکرام'' میں تحریر کرتے ہیں:

''چوں صیت بزرگی میر عبدالواحد سامعہ افروز اکبر بادشاہ گردید، معتمدی رانزد میر فرستاد واز کمال تمنا درخواست ملاقات نمود، میر قصد اردوئے معلّٰی کرد وچوں بدرگاہ سلطانی رسید بادشاہ اعزاز واکرام تمام بتقدیم رسانید وپانصد بیگھ زمین بطریق سیورغال نیاز کرد''(۹)

حضرت بلگرامی نے اپنی زندگی ہی میں اس زمین کو اپنی اولاد واحفاد میں تقسیم کردی، چار سو بیگھ اراضی فرزندوں کو اور پچاس بیگھ پوتوں کو دے دی اور پچاس بیگھ خانقاہ کے اخراجات کے لئے متعین کردیا۔ اس سے ان کی دنیا سے لاتعلقی اور بے ثباتی کا حال معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۱۷ھ میں یہ علم وعمل کا پیکر، متبع شریعت وطریقت سو سال سے زائد عمر عزیز گذار کر اپنے آبائی وطن بلگرام میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی اور وہیں پر تدفین بھی عمل میں آئی۔

تصنیف وتالیف حضرت بلگرامی کا خاص مشغلہ تھا، شعر وشاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، علم وادب کی مجلسوں میں خوب خوب اشعار کہتے، علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''احیانا بر موزونی طبع گوہر قافیہ می سنجید وطلائے خوش عیار سخن برمی کشید... دیوان غزل موجزے از موجود است وکلاش زمان خود دارد''(۱۰)

شاعری میں ''شاہدی'' تخلص رکھتے تھے، اور حافظ شیرازی کی تقلید اختیار کی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

''ایں کس درفن تلمیذ خواجہ حافظ شیرازی است قدس سرہ وخواجہ نیز بہ شاگردی خود مرا قبول کردہ وگویا بایں ضعیف ایمائے نمودہ ؎

ہر کہ در طور غزل نکتہ حافظ آموخت

یار شیریں سخن نادرہ گفتار من است(۱۱)

تصنیف وتالیف میں ''تصوف'' خاص موضوع تھا، اس سلسلہ میں آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ علامہ جمال الدین ابوعمرو ابن الحاجب کی

معروف نحو کی کتاب ''کافیہ'' جو آج تک مدارس اور علمی اداروں میں داخل نصاب ہے جس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں ہیں ان شرحوں میں ملا جامی کی شرح سب سے زیادہ معروف و مشہور ہے۔ حضرت بلگرامی نے انوکھے انداز میں حقائق اور معارف کی زبان میں اس کی شرح تصنیف کی اور اس طرح لکھی کہ سلاست الفاظ اور ربط الفاظ دونوں ہی موجود ہیں۔ متن نحو سے علم و معرفت کے مسائل کا استنباط کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن الحاجب کی ''کافیہ'' نہیں بلکہ تصوف کے موضوع پر کوئی کتاب ہے۔ حضرت بلگرامی نے یہ شرح اپنے دو عزیز دوستوں شیخ زین الدین اور شیخ جمال الدین کی فرمائش پر کی تھی۔ معارف وسلوک کے طرز پر کافیہ کی دو اور شرح کا ذکر علامہ آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' میں کیا ہے، ان میں سے ایک عربی زبان میں ہے جس کو میر ابوالبقاء جونپوری نے لکھی اور دوسری شرح ملا موہن بہاری نے بزبان فارسی لکھی۔ ملا موہن کا اصل نام ملا محی الدین ابن مولانا عبداللہ ہے، ''موہن'' اور بعض نے ''مومن'' ان کی عرفیت بتلائی ہے، بادشاہ اورنگزیب کے استاذ تھے۔ علامہ آزاد کا بیان ہے کہ انھوں نے ان دونوں شرحوں کو دیکھا ہے۔

حضرت بلگرامی کی تصانیف میں ''سبع سنابل'' بہت معروف و مشہور اور مقبول ہے، یہ تصوف کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے جس میں معرفت وسلوک، شریعت وطریقت کے بنیادی اور اہم نکات پر مفصل بحث کی گئی ہے، اس کی تحریر اس طرز پر ہے کہ جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ طریقت اور سلوک و معرفت کے راستہ میں شریعت کی پابندی از حد لازم ہے۔ بغیر شریعت کے طریقت کا تصور اسلام میں نہیں، حضرت بلگرامی نے جب یہ دیکھا کہ مرشدین و مسترشدین اور اس راہ کو اپنانے والے سالکین جو راہ راست سے ہٹ کر شریعت کو چھوڑ کر طریقت میں معرفت الٰہی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں اور معاشرہ میں بد دینی اور عقائد میں فساد برپا کر رہے ہیں تو ان کی اصلاح کے لئے کمر بستہ ہو گئے اور اپنے قلم حقیقت رقم کو جنبش دی، سبع سنابل میں حضرت بلگرامی تحریر کرتے ہیں:

''اہل بدعت وضلالت طائفہ باشند کہ خود را در لباس اسلام تلبیس پیدا آرند و عقائد فاسدہ خویش در باطن پوشیدہ دارند و با اہل اسلام بظاہر در آیند و خود را بصورت علمائے محقق بخلق نمایند و ہر کجا کہ مجال تصرف یابند تخریب قواعد مسلمانی با فساد عقائد ایمانی بنیاد نہند و دلہائے سادہ پاک را از طہارت فطرت بگردانند....وایں جماعت اعدائے دین و اخون الشیاطین و چوں بنور علم علمائے دیں و مشائخ اسلام ظلمات بدعت ایشاں مکشوف می گردد، ناچار علمائے شریعت را دشمن پندارند و علمائے ربانی کہ نجوم سپہر اسلام اند مردم را از شر ایں شیاطین الانس محفوظ می دارند'' (۱۲)

حضرت بلگرامی نے ''سبع سنابل'' کو سات فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل کو ''سنبلہ'' سے تعبیر کیا ہے، گویا ہر سنبلہ ایک ''بالی'' کے مانند ہے جس میں بہت سے بڑے چھوٹے دانے ہوتے ہیں اسی طرح اس کتاب کے ہر سنبلہ میں شریعت وطریقت کے بہت سی موتیاں موجود ہیں جن میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ پہلے ''سنبلہ'' میں عقائد و مذاہب سے متعلق اشیاء پر بحث کی گئی ہے جس میں انھوں نے علماء اہل حق کا مذہب فضلا و فقہاء اہل حق کی معتبر کتابوں کی روشنی میں واضح کیا ہے اور ان دوسرے مذاہب کا جن کے خیالات شریعت مطہرہ سے میل نہیں کھاتے ہیں ان کا محققانہ رد کر کے قلع قمع کر دیا ہے۔ دوسرے ''سنبلہ'' میں پیری و مریدی، مرشد و مسترشد اور ان کی حقیقت طریقت میں قدم رکھنے کے شرائط نیز ان کے اوصاف، ان کی علامتیں ذکر کی گئی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ طریقت اور شریعت دونوں الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بغیر شریعت کے طریقت کا کوئی اعتبار نہیں، مرشدین اور مسترشدین دونوں کو ہر حال میں شریعت کا پابند اور سنت کا پیروکار رہنا چاہئے۔ اور سالکین کو راہ سلوک اور مقامات معرفت طے کرانے کے دستور اور اصول بتائے ہیں۔

تیسرے ''سنبلہ'' میں ترک دنیا، قناعت، توکل اور زہد کی حقیقت قرآن کریم، احادیث مبارکہ نیز علما، فقہاء اور عارفین کے اقوال و حکایات کے ذریعہ محققانہ طرز پر، بہت ہی دلنشین انداز میں دنیا اور سامان دنیا کی مذمت کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بقدر ضرورت دنیا کے حصول کی رغبت بھی دلائی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ کیا مذموم ہے اور کیا محمود۔ ان مثالوں کو بیان کر کے اور ان سے نتائج اخذ کر کے مریدین و مسترشدین کی کردار سازی اور مردم سازی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کتنے اولیاء اللہ اور فضلاء صالحین ہوئے ہیں جو اسباب دنیا ہونے کے باوجود دنیا سے بے تعلق و بے رغبت رہے ہیں نیز ان کا برتاؤ اس فانی دنیا کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ چوتھے ''سنبلہ'' میں بزرگان دین اولیاء اللہ کے اخلاق کریمانہ، عادات و اطوار، عبادات و ریاضت،

معاملات ومعاشرت، صدق واخلاص کا ذکر ہے اوران کے سارے اعمال شریعت مطہرہ اور سنت نبوی کے عین مطابق رہتے ہیں، وہ ایک لمحہ بھی اپنی زندگی احکام خداوندی اور سنت رسول سے دور نہیں کرتے۔ پانچویں ''سنبلہ'' میں خوف اور امید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب سے خوف میں رہے اور اس کی رحمت وکرم کا امیدوار بھی بنا رہے۔ چھٹے ''سنبلہ'' میں حقائق وحدت معرفت ومحبت کا بیان ہے جس کے اثرات سالک کے راہ سلوک ومعرفت طے کر لینے اور اخلاق کریمانہ سے متصف ہوجانے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں جس سے سالک کا ظاہر و باطن منور ہوجاتا ہے۔ ساتواں ''سنبلہ'' متفرق فوائد کے ذکر میں ہے جس میں حضرت علامہ بلگرامی نے اپنے سلسلہ کے بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے اور یہی باب کتاب کا تتمہ بھی ہے۔

علامہ عبدالواحد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کی تالیف میں اس موضوع کے اہم مراجع سے استفادہ کیا ہے جس میں سے ''عوارف المعارف''، ''مجمع سلوک''، ''سلک السلوک''، ''احیاءالعلوم''، ''شرح آداب المریدین''، ''لب اللباب''، ''مثنوی مولانا روم'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس سے حضرت بلگرامی کی وسعت نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت بلگرامی کی اور بھی تصانیف ہیں مثلاً ''حقائق ہندی'' جس کے مطالعہ سے آپ کی ذہانت وطباعی کا پتہ چلتا ہے، نیز ''مکاتیب ثلاثہ'' ''رسالہ حل شبہات'' ''شرح معمہ قصہ چار برادر'' وغیرہ۔

حواشی:

۱ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، ۵۳۰۔ مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ
۲ مآثر الکرام، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی
۳ اصح التواریخ جلد اول خانقاہ برکاتیہ مارہرہ ص:۹۱ ۱۳۴۷ھ
۴ مآثر الکرام غلام علی آزاد بلگرامی ص: ۸
۵ نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر جلد پنجم ص: ۲۷۱
۶ منتخب التواریخ، نول کشور پریس لکھنؤ ص: ۳۰۰
۷ مآثر الکرام ص: ۳۴
۸ مآثر الکرام، ص: ۳۲
۹ اصح التواریخ جلد اول ص: ۱۴۱
۱۰ مآثر الکرام، ص: ۳۱
۱۱ سبع سنابل علامہ عبدالواحد بلگرامی ص:۹
۱۲ مآثر الکرام، ص:۳۰

☆☆☆

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multiligual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magezine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-2, Issue:- 6 to 12 JUNE To December 2016

Price: Monthly:-50rs., Annual:- 500rs.

Supervision

Professor Azeez Bano, HOD Persian, MANUU, Gachibowli, Hyderabad Telangana

Editor: **Syed Iliyas Ahmad Madni,**

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad, Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Editorial Board

Dr. Shaid Naukhez Azmi, D/o,Persian,Manuu

Dr. Mohd. Aqeel, D/o, Persian, BHU

Dr. Sakina I Khan, HOD Persian, BU

Dr. Mohd. Qamar Alam, D/o, Persian, AMU

M. Tauseef Khan Kaker, D/o, Persian, AMU

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Editor, quaterly DABEER, Kakori, Lucknow

Arman Ahmad

Editor, quaterly Irfan, Chapra, Bihar

Atifa jamal

Editor Yearly Kokab-E-Naheed, Sandila

Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad

Mutabbi Ali Khan, Daily Munsif, Hyderabad

Abbas Haider Naqvi, AMU, Aligarh

Advisory Board

Prof. Masood Anwar Alavi, AMU, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin, LU, Lucknow

Prof. Syed Hasan Abbas, BHU, Varanasi

Prof. S.M.Asad Ali Khursheed, AMU, Aligarh

P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad

Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.

Dr. S. M. Asghar Abidi, AMU, Aligarh

Ahmad Ali, Keeper Manuscript, Salarjung, Hyd.

Dr. S. Asmath Jahan, MANUU, Hyderabad

Dr. M. A. Naeem, Hyderabad

M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.

Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai

Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad

Intangible Cultural Heritage of Muslims in BareillyDivision: Need to document and safeguard it.

Ajmal Husain, Coordinator of 'ISHAN', MohallaSheikhupur, Baheri, Bareilly, U.P. 243201

Mob: 09990834374, e-mail: ajmalalig1@gmail.com

Abstract:

Bareilly Division of U.P is significant from cultural point of view. This research paper describes the intangible cultural heritage of Muslims of this region and focuses on the need of documenting and safeguarding this rich and dynamic living heritage.

Key Words:

Intangible Cultural Heritage (ICH), Documentation, Safeguarding, Muslims, Bareilly.

Intangible Cultural Heritage (ICH):

Each generation inherits a wealth of tangible and intangible resources that embody the collective memory of communities across the world.

Cultural heritage is not limited to material manifestations such as monuments and objects that have been preserved over time. This notion also encompasses living expressions and the traditions that countless groups and communities worldwide have inherited from their ancestors and transmit to their descendants, in most cases orally. This living heritage, known as intangible cultural heritage.1

Intangible Cultural Heritage means the practices, representations, expressions, knowledge, skills as well as the instruments, objects, artifacts and cultural spaces associated there with that communities, groups and in some cases individuals recognize as part of their cultural heritage. This intangible cultural heritage, transmitted from generation to generation, is constantly recreated by communities and groups in response to their environment, their interaction with nature and their history, and provides them with a sense of identity and continuity, thus promoting respect for cultural diversity and human creativity.2

In the UNESCO's Convention3 for the safeguarding of the intangible cultural heritage

(2004), the intangible cultural heritage (ICH) covers the following:

(a) Forms of oral expressions: performances and public expressions of poetry, history, myths, legends etc.

(b) Performing arts

(c) Social practices, rituals, festive events, community traits etc.

(d) Knowledge and practices concerning nature and universe.

(e) Traditional craftsmanship.

Muslims of Bareilly Division:

The identity of Muslims of India is thoroughly an Indian identity, very different form the Islamic identity of other Muslim countries with respect to socio-cultural traditions.4

This unique Indo-Islamic identity has evolved over centuries of intermingling of traditions, culture, religion and social contacts. The influence that practices of other religions had on the Islamic traditions and vice-versa also led to the evolution of unique socio-cultural traditions of the Muslims in India.

Bareilly Division of Uttar Pradesh consists of four districts namely Bareilly, Budaun,Pilibhit and Shahjahanpur . Total population of Bareilly Division is about eighty six lakhs5 and it covers about 17000 square km area. About 20% of total population of Bareilly Division constitutes Muslims. The Muslims in this region belong to 'Ahl-e-Tashee' (Shia) and 'Ahl-e-Sunnat-wa-al-Jamaat' (Sunni) sects. Sunnis are further subdivided into Ahl-e-Hadith, Deobandi and Bareilvi etc.

According to Government of India, the Bareilly is one of the Minority Concentrated Division in India on the basis of the 2001 census data on population, socio-economic indicators and basic amenities indicators.

Intangible Cultural Heritage of Muslims of BareillyDivision:

The Bareilly Division is an important region of U.P from intangiblecultural heritage (ICH) point of view. The ICH of muslims in Bareilly Division has evolved after a complex synthesis with local traditions, languages and religious practices over a long period of time. The ICH of muslims in this region may be described as follows:

1. Forms of oral expressions:

These include performances and public expressions of poetry, history, myths, legends

etc. Some of these are discussed here.

(a) Mushaa-irah and Shai'ry-Nashist:

This is very popular event in the cultural life of muslims of this region. As per its nature, it is not only cultural event but educational too. In this event poets and poetesses recite their Urdu poetry before the gathering. Mushaa-irah and Shai'ry-Nashist may be held on the various occasions. Generally it takes place on the eve of Eid-Milad-un-Nabi (PBUH) viz. at Baheri, Bareilly; on the eve of Urs of any Sufi/Wali viz. Urs of AalaHazrat, Bareilly; Urs of HazratShahjiMiyan, Pilibhit; Urs of Hazrat Shah SharafatMiyan, Bareilly; Urs of Hazrat Shah DaanaWali, Bareilly; Urs of Hazrat Shah Wilayat, Budaun and in Khanqah-e-Niyazia, Bareilly etc. and some times on the eve of marriage ceremony of a muslim boy or on the occasion of annual function in some educational institutes.

Mushaa-irah may be Na'atiya or it may be general in nature. Na'atiyaMushaa-irah is especially dedicated to Na'at. Na'at is a special type of poetry dedicated to Hazrat Mohammad (PBUH).

(b) Folk songs on the occasion of marriage ceremonies:

On the occasion of marriage of a muslim boy or a girl, a number of ritualistic ceremonies take place. Among them the rituals of Mehandi, Rasm, Rat-Jaga (night long celebration), Ubtan and Bhaat are common. On the time of these rituals muslim women generally sing various types of folk songs.

(c) Salaam:

Salaam is a special type of Urdu Poetry which is recited in the praise of Hazrat Mohammad (PBUH),HazratHusnain (RZ) and also in the praise of many other muslimsufis or religious personalities. The Salaam recitation takes place on the various occasion viz. the time of Jashn-e-Eid-Milad-un-Nabi (PBUH), the time of annual Urs of a sufi/Wali, the time of FatihaKhuwani and in the month of Moharram and Chehullum etc.

(d) Shijra recitation:

Shijra is a special type of Urdu poetry in which poet describes family tree of a sufi/Wali in a chronological order. This recitation generally takes place on the occasion of annual Ursof the Sufi/Walior on the occasion of FatihaKhuwani.

(e) Qawwali:

Qawwali is another form of oral expression. This is very old tradition in the cultural life of Indian muslims. This type of Urdu poetry is generally expressed on the eve of annual Urs of a sufi/Wali at his Dargah. In Bareilly Division there are various Dargahs and Khanqahs where, on the occasion of annual Urs celebration, this Qawwali event takes place.

(f) Qir'at, Na'at and ManqabatKhuwani:

The recitation of HoliQur'aan in a specific poetic manner is khown as Qir'atKhuwani. There are a number of styles for Qir'at, however each one is equally pleasing and peace providing for all the human beings. Na'at, as I have already stated, is a special type of Urdu poetry in which poet or poetess praises the life and work of Hazrat Mohammad (PBUH).Manqabat is also a type of Urdu poetry in which poet or poetess praises his/her spiritual teacher or any other Islamic personality.

Oral expressions like Qir'atkhuwani, Na'atkhuwani and Manqabatkhuwani generally take place on various occasions viz. at the time of Fatihakhuwani, on the occasion of annual Urs of a sufi/wali, on the occasion of Jashn-e-EidMilaad-un-Nabi (PBUH) and in the Majlis of Shohda-e-Karbala etc.

(g) Marsia, Noha and Majlis-e-Shohda-e-Qarbala:

Marsia and Noha are the types of Urdu poetry in which the poet describes the events of the famous battle of Karbala and its associated aspects. Marsiakhuwani (the recitation of Marsia) and Nohakhuwani (the recitation of Noha) generally take place during the month of Moharram and during the month of Safar (the month of Chehullum). Majlis-e-Shohda-e-Karbala is a type of religious conference, during the months of Moharram and Chehullum, in which the religious scholars and poets describe the various aspects of the famous battle of Karbala. These events of Marsiakhuwani, Nohakhuwani and Majlis-e-Shohda-e-Karbala are very common in the places like Senthal (Bareilly), Baheri (Bareilly), Pilibhit, Shahjahanpur, Budaun and Bareilly city.

(h) Mahfil-e- MilaadSharief:

MilaadSharief is another form of oral expression. In Mahfil-e-MilaadSharief, a group of some persons present various types of religious poetry which include Hamd, Na'at and Manqabat etc. This mahfil is generally organized on thursday or at the time of any special occasion.

(i) Mahfil-e-Islam Khand:

Islam khand is a special type of epic poem, composed on the same pattern of Aalhakhand, by RiyazuddinRiyaz of Baheri7.Whenever there is a need of rain in the months of summer, the muslims of Baheri used to organise the mahfil-e-Islam khand in which a group of 5 or 6 people sing this epic poem.

(2) Performing Arts:

The act of marshial art known as Akhaada is very famous among muslims. It is being played in the months of Moharram and Chehullum with the procession (Julus) of Taaziyah and Alams. Baheri, Senthal and Bareilly city are common places where the display of this marshial art may be seen.

(3) Social Practices:

In the cultural life of a muslim in Bareilly Division, a lot of events take place. Each event is characterised by a number of specific social practices which may be described as follows:

(a) Chhati:

After the birth of a child in a muslim family, a specific ritual is carried out which is known as chhati, this is generally performed on the 6th day of the birth of the child.

(b) Rasm-e-Bismillah:

This is very important event in the educational life of a muslim child. On this day the child initiates to get her education in the able supervision of an experienced teacher. From this day onwards, the child starts to learn the Holy Qur'an and also starts to get the school education simultaneously.This ritual is generally carried out when the child touches almost four years of her age.

(c) Cultural practices during the marriage ceremony:

On the occasion of marriage of a muslim boy or a girl, a lot of cultural practices are carried out by the family members. These include Nishra(the ritual of recitation of Holy Qur'an by the bride), Mehandi (the ritual of applying Henna on the palms of the bride and the bride groom), Ubtan (the ritual of applying turmeric-made paste on the face and hands of the bride and the bride groom), Taareekh (the ritual of deciding the exact date of the marriage), Sagaai and Mangni (the rituals of confirming and accepting the girl and the boy as the bride and the bride groom by the families of each other), Bhaat (the ritual of presenting various types of gifts to the parents of the bride and the bridegroom by the siblings of the concern parents),Daala

(the ritual of presenting gifts for the bride by the bridegroom's family. This include jewellary and clothing etc. The Daala is presented before Nikah ceremony), Sehra-bandi (the ritual of putting floral garlands on the head of the bridegroom by his family members. This is taken place on the eve of Nikah ceremony), Surma-lagaana (the ritual of applying surma in the eyes of bride groom by his sister-in-law), Pallu-daalna (the ritual of putting one side of head scarves on the head of the bridegroom, by his sisters, at the time of Sehra-bandi), Salaami (the ritual of presenting gifts and wishes to the bridegroom by the ladies relatives of the bride after the Nikah ceremony), Juta-churaai (the humorous ritual of stealing shoe of the bridegroom by the younger sister of the bride), Neki-baandhna (the ritual of putting and knotting of some beetle leaves and wishes etc. in the corners of the head scarf of the bride by her brothers), Rukhsati (the emotional moment of saying good bye to the bride by her relatives), Dehli-Ghirai (the ritual of getting some gifts from the bridegroom by his sisters before the first entrance, of the newly wedded couple, in the home), Gaud Bharaai (the ritual of putting some fruits and sweets etc. in the lap of the bride by her brothers on the second day of marriage), Tyohaari (the ritual of presenting sweets and gifts to the family of the bridegroom by the family of the bride on the occasion of festivals like Eid-ul-Fitr and Eid-ul-Azha etc.)

Along with the above major cultural rituals, some other minor cultural rituals also take place on the delightful occasion of the marriage.

(d) Cultural practices during the festivals:

The muslims of the Bareilly Division celebrate various festivals which include Eid-ul-Fitr, Eid-ul-Azha, Eid-Milaad-un-Nabi (PBUH), Kund-hei and Shab-e-Bara'at. During the Eid-ul-Fitr andEid-ul-Azha a very famous ritual is Eidi.Eidi is a traditional and emotional ritual in which elder members of a family present gifts and express wishes to the younger members of their family.

The festival Eid-Milaad-un-Nabi (PBUH) is celebrated every year on the auspiciousoccasion of the birth day of Hazrat Mohammad (PBUH). During this day muslims observe various cultural rituals which include FatihaKhuwani (the ritual of recitation of Holy Qur'an), Raushni and Sajawat (the ritual of decorating houses and mosques), ParchamFehraana (the ritual of hoistingcolourful flags on the top of the houses. It is a new tradition started from last ten years), Shabeeh-e-Roza-e-Khizra (in some places like in Baheri, somemuslims' welfare

organizations make three dimensional replica of the Roza of HazratMohammadPBUH) and Julus-e-Eid-Milaad-un-NabiPBUH (the ritual of organizing religious procession in the form of a caravan on this day.)

Kund-hei and Shab-e-Bara'at are also important festivals in the cultural life of muslims in the Bareilly Division. Kund-hei-Bharna(putting sweet purees in the terracotta pots) is the main ritual on the day of Kund-hei festival. On Shab-e-Bara'at festival the main ritual includes making Halwaa in the houses and distributing it to the relatives. The another activity by the muslims, on the night of Shab-e-Bara'at, is offering night long prayers in the mosques.

(e) Niyaaz of GyarahwinSharief:

Niyaaz of GyarahwinSharief is not a festival but it is an important religious and cultural event. In the 4th month of Islamic Calendar, muslims of Bareilly Division make arrangement for the feast of their relatives and for the poors. Any day of the 4th month may be chosen for this feast as per the convenience. This Niyaaz is actually dedicated to Hazrat Sheikh Abdul QadirJeelani (RH), the famous Sufi of the QadriSilsilah.

(f) Moharram and Chehullum:

10thMoharram is an important day of the Islamic history. This mourning day is observed in the momory of famous battle of Qarbala. Chehullum is observed after 40 days of Moharram.

During Moharram and Chehullum, muslims of this region observe various rituals which include Taaziya making(the making of 3-dimensional decorated structures), Alam making(the making of structures made up of long sticks and flags), Taaziyadaari(the procession of Taaziya), Julus-e-Alam (the procession of alams), Sabeel (the free arrangements of drinking water, sharbat and tea etc.), Langar (the free arrangements of food and biryani etc.) and ImambaadawaQarbala (the places for putting the Taaziya). From aesthetic point of view, the each Taaziya looks like a masterpiece of decorative art.

(g) Urs (the annual death anniversary of a Sufi/Wali):

Bareilly Division is famous forAuliyas and Sufis.There are various dargahs and khenqahs in this region. Among them the famous dergahs and khanqahs are of AalaHazrat (Bareilly), HazratShahji Mohammad SherMiyan (Pilibhit), Hazrat Shah DaanaWali (Bareilly), Hazrat Bashir Miyan (Bareilly), HazratSharafatMiyan (Bareilly) Hazrat Shah Wilayat (Budaun

),HazratAcchheMiyan (Baheri) and Khanqah-e-Niyazia, Bareilly.

On these dargahs and khanqahs, the followers of theAuliyas and Sufis observe Urs every year. During the Urs, a number of cultural events take place. These include Julus-e-ParchemKushai (the procession of flag to inaugurate and announce the annual Urs), ChaadarPoshi (the event of covering the Sufi's/Wali's grave with sheet like cloth) and Urs-Mela (the temporary arrangements of shopping and amusement facilities, in a vast ground, for the public).

Some other cultural events also take place on the occasion of annual Urs which include Fatiha-Khuwani, Manqabat-Khuwani, Taqaareer(theprogramme of speeches), Qawwali,Qul-Sharief, Sabeel and Langar etc.

(h) Some other socio-cultural and religious practices:

Apart from the above discussed practices, some other socio-cultural and religious practices are also important in the life of a muslim in Bareilly Division. Among them the important practices are Roza-Iftaar (arrangement of feast for thefast-observers i.e. for Rozadaars during the month of the fast i.e. in the month of Ramzan)

Haj Rawaangi (the departure for pilgrimage i.e. for Haj, in the presence of relatives), Haj Aamad (the arrival from Haj and welcoming by the relatives), Haj Daawat (the arrangement of feast for relatives by the Haji i.e. by the person who is going to pilgrimage and vice versa) and Jumerat'sFatiha (the ritual of the recitation of the Holy Qur'aan, on every Thursday eveving, over a sweet dish and food etc. and distributing it to the children).

Whenever, the death of a muslim person occurs in this region, the relatives of the person follow various rituals. Among them Soem, Daswaan, Beeswaan, Chaaleeswan and Barsi are important to mention here.

Soem, Daswaan, Beeswaan, ChaaleeswanandBarsiall are a type of group duas for the departed soul, by the relatives, which take place on the 3rd day, 10th day, 20th day, 40th day and annual day from the date of the death of the concern person respectively.

(4) Traditional Craftsmanship:

The muslims of Bareilly Division are traditionally expert in the making of Kite, Manjha (the sharp thread for kite flying), Surma (the black powder for eyes), Bamboo Furniture Work and Zardozi Work (the decorative work on clothes for ladies). Many muslim families of Bareilly

city are traditionally engaged in producing the above items on a small scale.

Documentation and Safeguarding of ICH:

In the recent years, there is an increasing importance shown by UNESCO towards intangible heritage. As a driving force of cultural diversity, living heritage is very fragile due to local and global factors. In the recent time, it has received international recognition and its safeguarding has become one of the priorities of international cooperation.

New a days, due to lack of awareness and various other factors, the intangible cultural heritage of muslimsin Bareilly Division is at the risk of disappearance. For example the oral traditions, like Islam khand, shijra, Salaam etc. knowing people are very rare in this region. This intangible cultural heritage possesses important and significant values. To pass on to future generations, it must be preserved and documented properly.

In the modern times when the diversity of human cultural heritage is being threatened by the forces of globalization, it is very necessary for cultural organizations to focus on the issues of preserving and conserving the diversity of cultural heritage (both tangible and intangible) and identities of the world.

Minority people, due to their smaller populations and lack of popularity of their culture, often face difficulties in achieving their goals, especially with respect to maintaining their own languages and cultures. Efforts to safeguard the traditional culture of ethnic minorities have been initiated in some parts of our country8.

An understanding of the intangible cultural heritage of different communities helps in inter-cultural dialogue, and encourage mutual respect for other ways of life.

The recording and documenting (in the form of audio, video, written and photographs etc.) of intangible cultural heritage is a valuable means for preserving records of activities and expressions, and offers an alternative means of passing them on to future generations.

In societies where the loss of indigenous knowledge, due to modernization and cultural homogenization, seems inevitable, recording and documenting can help to maintain knowledge that has been collected through generations.

Conclusion:

The majority of muslims of India are very backward economically and educationally.9The condition is not much better in Bareilly Division too. In this area there is no

cultural centre and no awareness centre for muslims. The documentation of the intangible cultural heritage of muslims of this region has never been attempted before. So, in my opinion, there is a need of the time to document this rich intangible cultural heritage. The documented information may be shown and displayed in the form of a heritage interpretation centre. Such centre will work as awareness centre-cum- interpretation centre, and will be helpful for socio-cultural upliftment of the community.

To understand the minority community with broader perspective and to create social harmony, the documentation and safeguarding of its culture is necessary, so that we may discover the enormous diversity of living heritage of our land whose elements are vital for all of us as citizens of India.

References:

1. UNESCO'S Convention 2001. http://unesco.org/culture/ich/index.php. (accessed July 29,2010)

2. UNESCO'S Convention 2003. http://unesco.org/culture/ich/index.php. (accessed July 29,2010)

3. UNESCO'S Convention 2004. http://unesco.org/culture/ich/index.php. (accessed July 29,2010)

4. Ahmad, Imtiyaz. 1985. Ritual and Religion among muslims of Sub-continent. Lahore, Vanguard.

5. http://censusindia.net/. (accessed July 27,2010)

6. http://pib.nic.in/release/release.asp?. (accessed July 27,2010)

7. Arshad, M.2003. RazmiyaShayar-RiyazuddinRiyaz.Moradabad, A.H. Printers.

8. Documentation of languishing art of Jogi Singers and Performers of Haryana was carried out by INTACH, New Delhi (2008)

9. Justice RajendraSachar Committee Report - 2006
www.minorityaffairs.gov.in/newsite/sachar/sachar-comm.pdf. (accessed July 28,2010)

☆☆☆

कितने पाकिस्तान : एक राजनीतिक अध्ययन

दरख़्षाँ ग़नी असिस्टेंट प्रोफेसर, हिन्दी विभाग, जी. एफ़ कालेज, षाहजहाँपुर

अगर हम इतिहास देखें तो पाएंगे कि साहित्य और राजनीति का संबंध बहुत पुराना है। संस्कृत साहित्य से परिचित लोग जानते हैं कि बाणभट्ट की कादंबरी में 'षुकनासोपदेष' राजनीति के बारे में एक गंभीर उपदेष है। प्रसिद्ध ग्रंथ 'पंचतन्त्र' की रचना ही राजकुमारों को राजनीति की षिक्षा देने के लिए हुई थी। कालिदास ने भी अपनी रचनाओं में राजनीति पर टिप्पणी की है। विषाख का 'मुद्राराक्षस' तो विषुद्ध रूप से राजनीतिक नाटक है। यहाँ यह प्रष्न उठना स्वाभाविक है कि आख़िर क्यों साहित्य से राजनीति के जुड़ाव की एक परम्परा रही है। इसके उत्तर में यह कहा जा सकता है कि साहित्य समूचे समाज से जुड़ा होता है जिसका एक रूप राजनीति है। अतः साहित्य और राजनीति का संबंध भी अत्यंत स्वाभाविक है।

अगर कलाकार अथवा साहित्यकार में बुनियादी ईमानदारी है तो वह किसी भी क़ीमत पर जनता का पक्ष नहीं छोड़ेगा, लेकिन जनता के सर्वोत्तम हितों की रक्षा में उसका योगदान नाम मात्र का ही रहेगा। जब तक कि वह विधमान राजनीतिक जटिलताओं की तह में पहुँचकर उनकी ओर सारे संघर्शरत लोगों का ध्यान आकर्शित नहीं करता। राजनीति की ज़मीन पर होने वाली हार जीत संपूर्ण जीवन को प्रभावित करती है। कलाकार सुंदर जीवन का सपना देखता हुआ उसे साकार करने में तब तक असमर्थ रहेगा जब तक कि समकालीन राजनीतिक परिस्थितियाँ अनुकूल नहीं होंगी।

किसी भी युग की राजनीतिक स्थितियों को उस काल की सामाजिक एवं सांस्कृतिक परिस्थितियों से अलग नहीं कर सकते। इस दृश्टि से कमलेष्वर के उपन्यास 'कितने पाकिस्तान' में हम उन बिन्दुओं एवं स्थितियों का अध्ययन करेंगे जो राजनीति से संबंधित हैं।

' कितने पाकिस्तान' में कमलेष्वर ने विभिन्न राजनीतिक बिन्दुओं को उठाया है। देष के नेता, राजनेता अपने स्वार्थ के लिए राजनीति का दुरूपयोग करते हैं और देष की स्थिति से बेख़बर रहते हैं। चुनाव के समय और सरकार बनाने–गिराने के समय तो जनता से संवाद के लिए व्याकुल रहते हैं परन्तु देष की सुरक्षा के लिए प्राण न्योछावर कर देने वाले सैनिकों के प्रति कोई दायित्व बोध नहीं होता। उपन्यास में 'अदीब' देष के प्रधानमंत्री और रक्षामंत्री के नाम षिकायती पत्र में उनकी इसी संवेदनहीनता तथा लापरवाही की ओर संकेत करता है–"प्रिय प्रधानमंत्री और रक्षामंत्री जी। यह तो आपके नैतिक पतन की पराकाश्ठा है कि जब आपकी सरकार गिराई गई थी, तो दूसरे ही दिन आप देष की जनता को सन्देष देने के लिए दूरदर्षन पर मौजूद थे, लेकिन जब उत्तरी सीमान्त पर स्क्वाड्रन लीडर अजय कुमार आहुजा मारा गया, लाइट लेटिनेंट नचिकेता अपनी जान को ख़तरे में डालकर क्षतिग्रस्त जहाज़ से कूदा, जब कारगिल क्षेत्र में ही वायुसेना का हेलिकाप्टर क्षतिग्रस्त हुआ और चालक दल के चार सदस्य मारे गए, साथ ही सरकारी आँकड़ो की विष्वसनीयता संदिग्ध होने के बावजूद यह बताया गया कि हमारी सेना के 29 जवान मारे गए हैं, 128 घायल हैं तथा 12 लापता हैं, तब इस देष को विष्वास में लेने के लिए, उसके संकट और दुख में षामिल होने के लिए आपको दूरदर्षन पर आने की ज़रूरत महसूस नहीं हुई! यह संवेदन हीनता की इन्तिहा है।''59

उपन्यास में कमलेष्वर बड़ी गम्भीरता के साथ देष के नेता और मंत्री की संवेदन षून्यता को प्रस्तुत करते हैं।

पत्रकार की कलम में बहुत षक्ति होती है यदि वह सत्य लिखे। कमलेष्वर स्वयं एक पत्रकार थे और वह चाहते थे कि लाहौर के पत्र 'फ्राइडे टाइम्स' के एडिटर नज़म सेठी अपनी कलम के द्वारा युद्ध को रोकने का प्रयास करें। 'कितने पाकिस्तान' में कमलेष्वर ने दुनिया भर की उन समस्याओं को उठाया है जो मानव जाति के निरंतर हो रहे विनाष का कारण है। अदीब की अदालत में विभिन्न प्रकार की दस्तकें अपनी अपनी समस्याएँ लेकर आती हैं जिसमें एक कोसोवो प्रदेष की दस्तक है। जो अपने विनाष की समस्या लेकर आई है। कमलेष्वर नियन्त्रण की राजनीति के संबंध में इस प्रकार लिखते हैं– "नियन्त्रण द्वारा आत्माओं को तोड़ा जाता है.....फिर उन्हें विभाजित किया जाता है.....उनमें सांस्कृतिक प्रतिरोध की षक्ति विखंडित की जाती है और तब बाज़ारवादी जोंके उस विभाजित कौम का सारा रक्त चूस लेती हैं। खंडित संस्कृति के षमषानों में तब उत्सव के बाज़ार स्थापित होते हैं.....धर्म और इतिहास षोशकों के हाथों में खिलौना बनकर नाचते गाते, जष्न मनाते अपने ही विभाजित अंग के षत्रु और अपने विनाष का कारण बन जाते हैं.....बड़ी सभ्यताओं को तोड़कर उन्हें बन्दी बनाने के लिए विभाजन का यही रास्ता उन असभ्य अपसंस्कृतियों ने चुना है..... जिनके खेतों में सिर्फ़ बारूद और बन्दूकें उगती हैं.....नाटो राक्षसों के इकतरफ़ा मिसाइली हमले जारी हैं....वायुमंडल और प्राचीन नदी डैन्यूब का पानी विशाक्त हो गया है..मृत्यु पागलों की तरह ज़िन्दगी का पीछा कर रही है।''60

डैन्यूब नदी की घाटी में बसे सर्बिया और युगोस्लाविया पर 'नाटो' के वैज्ञानिकों ने अपने हितों के लिए, कोसोवों को अपने नियन्त्रण में रखने के लिए उस पर मिसाइली हमला करके उसको नश्ट कर दिया। लेखक इस बात से दुखी है।

प्रत्येक षक्तिषाली देष, दूसरे देष पर अपना वर्चस्व स्थापित करने के लिए उस पर अपना नियन्त्रण रखना चाहता है। नियन्त्रण के द्वारा लोगों की आत्माओं को तोड़कर गृह कलह कराकर उन्हें विभाजित कर दिया जाता है और उस विभाजित क़ौम को षक्तिषाली देष बिल्कुल नश्ट कर देते हैं। नश्ट और खंडित संस्कृति को षमषान बना दिया जाता है फिर उसी षमषान पर वही षक्तिषाली देष अपनी सफ़लता का जष्न मनाते हैं, खुषी मनाते हैं। षोशण करने वाले देष धर्म और इतिहास का ग़लत लाभ उठाकर संस्कृतियों को नश्ट कर देते हैं।

भारत की दीर्घ काल की औपनिवेषिक दासता से मुक्ति विष्व मानवता के इतिहास की अनुपम एवं अद्वितीय घटना है। यह निर्विवाद है कि ब्रिटिष कूटनीतिज्ञों ने अपने साम्राज्य को बनाए रखने के उद्देष्य से हिन्दू और मुसलमानों के बीच साम्प्रदायिकता का बीज बोने का कार्य किया। कॉंग्रेस के नेतृत्व में होने वाली राश्ट्रीय आंदोलन की तीव्र गतिविधियों और भारतीय जनता में जाग्रत होती प्रखर राजनीतिक चेतना से ब्रिटिष षासकों की नीति में परिवर्तन आया।

भारतीय नेताओं एवं राजनीतिज्ञों की कूटनीति, स्वतन्त्रता प्राप्ति और अधिकार की लालसा तथा ब्रिटिष साम्राज्यवादी कूटनाति विभाजन का कारण बनी। 'कितने पाकिस्तान' में कमलेष्वर ने देष के महत्वपूर्ण लीडरों की उस मनः स्थिति को दिखाने का प्रयत्न किया है जो विभाजन को लेकर दुखी थे। लेकिन बाज़ी हाथ से निकल चुकी थी और जनता के बीच पहुँच चुकी थी इसलिए अब पीछे नहीं हटा जा सकता था– "महात्मा गाँधी, नेहरू, पटेल, ग़फ़ार ख़ाँ और यहाँ तक कि जिन्ना भी विभाजन के मसौदे को लेकर उदास थे.....गाँधी ने पहली बार सत्ता को धारण करने के औचित्य की धारणा को राजवंषों से छीनकर जनता को सौंप दिया है। यहीं से इस दुनिया का रूप बदलना षुरू हुआ है.....कोई सम्राट अपने फ़ैसलों को कई बहानों और तरीकों

से बदल सकता है। वह प्रधानमंत्री, सिनेट या सलाहकारों का सहारा लेकर अपनी इज़्ज़त बचा सकता है...लेकिन जनता के लीडरों की जो नई जमात आई है, वह अपने सार्वजनिक उद्रेक में जो कुछ कह जाती है, उन स्थापनाओं से पीछे नहीं हट सकती....यही मोहम्मद अली जिन्ना की विडम्बना और त्रासदी है। उन्होंने एक बार सार्वजनिक तौर पर इंडिया का विभजन माँग लिया तो फिर उनका मन चाहे जितना पछताता रहे वे उस माँग से पीछे नहीं हट सकते.....हटेंगे तो अपना नेतृत्व खो देंगे।''61

न चाहते हुए भी लीडर किस तरह अपने ही बुने जाल में उलझ गए थे। लेखक ने इसका स्वाभाविक चित्रण किया है।

सन् 1940 ई0 में लाहौर घोशणा पत्र में सिन्धियों को संपूर्ण स्वायत्तता देने का वादा किया गया था, लेकिन 1947 ई0 में पाकिस्तान बनने के बाद सत्ता के इरादे बदल गए। धोखा खाने के कारण पूर्वी पाकिस्तान टूटकर बंगला देष बना। अब सिन्धी अपना सिन्ध स्वतन्त्र कराना चाहते हैं।

वर्चस्व और सत्ता प्राप्त करने की लालसा ही विभाजन और युद्ध का कारण बनती है। सत्ता प्राप्ति के नषे के सामने किसी भी रिष्ते का कोई महत्व नहीं रह जाता। इसी लिए पाकिस्तान बन जाने के बाद वहाँ गृहयुद्ध की स्थिति बनी हुई है और भारत के मुसलमानों की स्थिति बेहतर नहीं कही जा सकती। कमलेष्वर उपन्यास में यही स्थिति मुग़ल काल में दिखाते है। सत्ता प्राप्त करने के लिए औरंगज़ेब ने रौषन आरा के साथ मिलकर अपने भाई और पिता के विरूद्ध शड़यन्त्र रचा। जब इस कूटनीति का पता षहंषाह को चला तो वह कहता है–"तकलीफ़ इस बात की है कि औरंगज़ेब और रौषनआरा, मेरे एक बेटे और एक बेटी ने मिलकर मेरे ख़िलाफ़ साज़िष की।"62

मुग़लकाल की राजनीतिक स्थिति में धर्म की बहुत बड़ी भूमिका थी। 'कितने पाकिस्तान' में औरंगज़ेब और दाराषिकोह के सत्ता संघर्श तथा राजनीतिक अन्तर्द्वन्द्व पर विस्तार से चर्चा की गई है। औरंगज़ेब ने सत्ता के लिए धर्म का उपयोग किया और अपनी कूटनीति से दाराषिकोह को हरा दिया। औरंगज़ेब अपनी बहन रौषनआरा के साथ मिलकर दाराषिकोह के विरूद्ध शड़यन्त्र रचता है, जिसका चित्रण कमलेष्वर ने इस प्रकार किया है–"आपा! मैं क्या करूँ.....भाईजान दाराषिकोह को कोई भी सज़ा देते मेरी आत्मा काँपती है..... हिन्दुस्तान की सारी प्रजा उसे चाहती है। ख़ास तौर से दिल्ली की प्रजा कभी भी मेरे ख़िलाफ़ विद्रोह कर सकती है। इस विद्रोह को दबाने का एक ही तरीक़ा है–रौषनआरा ने कहा। हिन्दुस्तानी प्रजा की मज़हब परस्ती और मज़हब के लिए उसकी आधार भूत कमज़ोरी का तुम इस नाजुक वक़्त में फ़ायदा उठाओ। तुम दाराषिकोह के ख़िलाफ़ काफिर और अनेकेष्वरवादी होने का इल्ज़ाम लगाकर उलेमाओं से उसकी सज़ाए मौत का फ़तवा जारी करवा दो।''63

कमलेष्वर यहाँ यह दिखाना चाहते हैं कि भारत की धर्मभीरू प्रजा की मानसिकता का लाभ एक ओर मुग़लकाल में उठाया गया तो दूसरी ओर ब्रिटिष सरकार ने भी भारत की धर्मभीरूता को अपना हथियार बनाया।

कमलेष्वर मध्ययुग की राजनीति, कूटनीति तथा शड़यन्त्रों की सच्चाई का पता लगाने का प्रयास करते हैं। अदीब के माध्यम से उसे स्पश्ट करते हुए लिखते हैं–"मैं मानता हूँ बाबर आक्रन्ता था.....लेकिन उसके पष्चाताप को कभी समझा ही नहीं गया।.....उससे हज़ारों वर्श पहले ओड़िसा का कलिंग राज्य भी स्वायत्त प्रदेष नहीं, अपने राजा के अधीन स्वतन्त्र देष था। अषोक ने कलिंग पर जब आक्रमण किया तो वह भी आक्रान्ता था.....युद्ध में इतना खून बहा कि दया नदी का पानी लाल हो

गया था.....अपनी इस बर्बता का पष्चाताप तब अषोक ने पंचषील और अहिंसा के सिद्धान्तों को देकर किया था। यदि अषोक का पष्चाताप भारतीय था तो भारत को अपना देष मान लेने वाले मुग़लों के पष्चाताप के क्षणों को हम अभारतीय क्यों कहना चाहते हैं ? वे अरबी, तुर्की, तातारीया अफ़ग़ानी पष्चाताप के क्षण नहीं, वे भारतीय भूमि पर उदित हुए उनके गहन पष्चाताप के क्षण थे! अकबर उस भारतीय पष्चाताप का सबसे ज्वलंत उदाहरण है.....और जहाँगीर तथा षाहजहाँ के पष्चाताप का नतीजा था–दाराषिकोह! लेकिन मुष्किल यह है कि राजतन्त्र की कोई धर्म संस्था, कोई मज़हबी तहरीक किसी षोक और पष्चाताप को मंजूर नहीं करती....क्योंकि धर्म या मज़हब ज़िन्दगी की सच्चाइयों से हमेषा सदियों पिछड़ा रहता है! और यही तमाम बेबुनियाद पाकिस्तानों की बुनियाद बनता है।''64

उपन्यासकार यह कहना चाहता है कि बाबर और अषोक ने युद्ध की विभीशिका के बाद जो पष्चाताप किया उसे समान भाव से स्वीकार किया जाना चाहिए।

उपन्यास में कमलेष्वर ने यह भी देखने का प्रयत्न किया है कि ईस्ट इंडिया कम्पनी ने किस तरह भारत में घुसपैठ की। 1600 ई0 में हिन्दुस्तान में ईस्ट इंडिया कम्पनी की स्थापना के साथ ही धीरे धीरे अँग्रेज़ों ने हिन्दुस्तान पर अपनी जड़े मज़बूत करना आरम्भ कर दिया। ईस्ट इंडिया कम्पनी के इन अँग्रेज़ व्यापारियों ने हिन्दुस्तान से काली मिर्च, लौंग, इलायची, अदरक, दालचीनी, नील तथा अफ़ीम निरंतर अपने देष भेजी।

अँग्रेज़ अफ़सर रॉबर्ट क्लाइव हिन्दुस्तान के विरूद्ध शड़यन्त्र रचता रहा। अँग्रेज़ धीरे धीरे हिन्दुस्तानी हुकूमत की जड़े काटने लगे और इसके साथ ही नवाब और रजवाड़ों की आपसी लड़ाई का लाभ उठाने का प्रयास करने लगे। ईस्ट इंडिया कम्पनी ने बंगाल के माल गोदामों के नाम पर क़िले बनाकर उनकी चौकीदारी के लिए फ़ौज खड़ी कर ली। बंगाल के नवाब सिराजुद्दौला ने इन ग़ैर कानूनी हरकतों को स्वीकार नहीं किया।

किसी भी धर्म का प्रयोग जब राजनीतिक लाभ के लिए किया जाता है तो विभाजन अवष्य होता है। कमलेष्वर 'कितने पाकिस्तान' में यही बताना चाहते हैं–"इस्लाम में हर कुदरती ज़रूरत के लिए जगह है, लेकिन जब मज़हब को सियासी फ़ायदे के लिए नफ़रत में बदला जाता है तो एक नहीं तमाम पाकिस्तान पैदा होते हैं!''65

कोई भी धर्म ज़िन्दगी जीने के लिए पाबन्दियाँ नहीं लगाता है। वह तो केवल सही और ग़लत का फ़र्क बताता है। प्रत्येक धर्म का जीवन मूल्य एक ही होता है। धर्म के आधार पर किये गए बँटवारे की क़ीमत यहाँ के निवासियों ने अपना घर, अपना वतन, अपने जज़्बात, अपनी यादों और अपने रिष्तों को बाँटकर अदा की। कमलेष्वर विभाजन के समय की लोगों की मानसिक स्थिति का वर्णन करते हुए लिखते हैं–"रामपुर रियासत के आला वज़ीर के दो जवान बेटों ने अलग अलग फैसला किया था। बड़ा बेटा मेजर याकूब ख़ान, जो वायसराय के अंगरक्षकों का नायब मुखिया था, वह बेहतर मौक़े और ओहदे की तलाष में पाकिस्तान चला गया था। छोटा बेटा कैप्टन यूनुस ख़ान अपनी यादों को छोड़ नहीं पाया था। उसने हिन्दुस्तान में ही रहना मंजूर किया था। इतिहास ने सन् 1965 ई0 की भारत पाक जंग में विभाजन की त्रासदी का दर्दनाक मंज़र देखा था! कष्मीर में पुंछ की पहाड़ियों में घमासान युद्ध हुआ था। पाकिस्तान के फ़ौजी दस्तों का कमांडर था– वही रामपुर का याकूब ख़ान और हिन्दुस्तान की गोरखा रेज़ीमेन्ट की कमान सँभाले था– रामपुर का यूनुस ख़ान! दोनों सगे भाई एक दूसरे के आमने सामने थे। विभाजन की क़ीमत दोनों चुका रहे थे.....सवाल ज़िन्दगी और मौत का था। सवाल अपने अपने देष का था। भारतीय

मेजर यूनुस ख़ान आक्रमण करते हुए चीख़ा था–भाई जान बचिए! याकूब ख़ान ज़िन्दा नहीं बच पाया था। मेजर यूनुस ख़ान ने अपने 'दुष्मन' बड़े भाई को हराने के बाद उसे वहीं द़न किया था, और प्रीमैच्योर रिटायरमेंट लेकर रामपुर लौट गया था।''66

सन् 1947 ई0 में हिन्दुस्तान के विभाजन के बाद जब अँग्रेज़ अफ़सर वापस जा रहे थे। उसी समय आर्मी के अफ़सर का भी बँटवारा होने लगा था। दिल्ली छावनी से हिन्दु और सिख सिपाही अपने मुसलमान साथियों को विदा कर रहे थे, उधर रावलपिण्डी छावनी से मुसलमान सिपाही अपने हिन्दू और सिख सिपाही साथियों को विदा कर रहे थे। सबसे अधिक असमंजस की स्थिति भारत की छावनियों से जाने वाले मुसलमान फ़ौजियों की थी। उन्हें किसी भी देष की फ़ौज में रहने की आज़ादी थी। उन्हें यह चुनाव स्वयं अपनी मर्ज़ी से करना था। पाकिस्तान का निर्माण धर्म के नाम पर किया गया था, और हिन्दुस्तान को सेक्यूलर घोशित किया गया था। उपन्यासकार ने विभाजन के परिणामस्वरूप उत्पन्न होने वाली मौत, दुख–दर्द, निराषा तथा रिष्तों के विघटन को बड़ी मार्मिकता के साथ प्रस्तुत किया है।

कमलेष्वर ने संपूर्ण उपन्यास में विभाजन के कारणों पर प्रकाष डालते हुए उससे उत्पन्न होने वाले दुख दर्द को विभिन्न राजनीतिक बिन्दुओं के माध्यम से उठाया है। इसके साथ ही वे कुछ महत्वपूर्ण सवालों के जवाब भी ढूँढते नज़र आते हैं जैसे बाबर ने अयोध्या के राम मन्दिर को नहीं तोड़ा था। औरंगज़ेब ने दारा षिकोह को मृत्युदण्ड देने के लिए हिन्दुस्तान की प्रजा की धर्म भीरूता का फ़ायदा उठाया। धर्म और भाशा को आधार बनाकर लड़ाओ और राज्य करो यह अँग्रेज़ों की औपनिवेषिक नीति का एक हिस्सा था।

सन्दर्भ ग्रन्थ सूची :

1. कितने पाकिस्तान, पृश्ठ 15–16
2. वही, पृश्ठ 45
3. वही, पृश्ठ 53
4. वही, पृश्ठ 189
5. वही, पृश्ठ 239–240
6. वही, पृश्ठ 199–200
7. वही, पृश्ठ 136
8. वही, पृश्ठ 323–324

☆☆☆